بسم اللہ الرحمن الرحیم

حرف آغاز

ہندوستان، اس کے تہذیب وتمدن، کلچر اور سماجی اقدار و روایات پر خطرات کے نہایت گھنے اور گہرے بادل منڈلا رہے ہیں، اور سماجی ومعاشرتی صورت حال دن بدن نہایت سنگین ہوتی جارہی ہے۔ بڑھتی ہوئی مذہبی منافرت، اور تعصب وشدت پسندی کی وجہ سے یہاں کی گنگا جمنی تہذیب، بھائی چارہ، اور قومی اتحاد ویکجہتی کی فضا تو پہلے ہی سے مسموم اور زہر آلود ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شر پسند بین الاقوامی طاقتیں جو پوری دنیا کو فتنہ وفساد کی آماجگاہ بنا دینا چاہتی ہیں، ان کی آنکھوں میں ہندوستان کے باشندوں کی اتحاد ویکجہتی- جو ہندوستان کی اصلی طاقت ہے- بری طرح کھٹک رہی ہے، اور وہ اس کو سبوتاژ کر کے اس کے تار وپود کو بکھیر دینا چاہتی ہیں۔

یہ صورت حال تو اپنی جگہ، یہاں کی تہذیب ومعاشرت کے لیے ایک نہایت سنگین مسئلہ آبروریزی، عصمت دری، زناکاری نیز جسم فروشی کے بڑھتے ہوئے اور تقریباً روزمرہ پیش آنے والے واقعات ہیں، یہ اتنا خطرناک مسئلہ ہے، جس کی زد میں ہندوستان کا- چاہے وہ مسلم ہو یا غیر مسلم- پورا معاشرہ اور پوری سوسائٹی ہے۔ گھر کی چہار دیواری ہو، عوامی مقامات ہوں، نقل وحمل کے ذرائع ہوں، یا تعلیم گاہیں، حتی کہ عبادت گاہوں تک میں یہ ہلاکت خیز زہر بری طرح سرایت کر رہا ہے، حتی کہ کم سن بچیوں سے لے کر معمر اور سن رسیدہ خواتین تک کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ جنسی بدسلوکی اور بے راہ روی کے آئے دن جو واقعات پیش آرہے ہیں، ان میں کچھ تو یقیناً تشدد اور زبردستی سے پیش آنے والے ہوتے ہیں، لیکن بہت سے واقعات خود سپردگی اور رضا مندی کے مہلک نتائج ہوتے ہیں۔ یہ اتنی خطرناک صورت حال ہے جس سے پورا معاشرتی نظام اور سماجی ڈھانچہ درہم برہم ہونے کو ہے۔ ہندوستان کی فضا اور یہاں کی آب وہوا میں شرم وحیا، پاک دامنی اور عزت وآبرو کی حفاظت

ہے، لیکن جدید مغربی کلچر نے اس پر جس طرح یلغار کیا ہے، اس نے اس کو سخت نقصان پہنچایا ہے اور پہنچا رہا ہے۔

مگر افسوس یہ ہے کہ اس صورت حال کو جس سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہئے، اس طرح لیا نہیں جا رہا ہے۔ جب زبردستی عصمت دری یا آبروریزی کا کوئی واقعہ رونما ہوتا ہے، تو اس پر واویلا تو مچتا ہے، احتجاج اور مجرموں کی سزا کا مطالبہ بھی ہوتا ہے، پھر وہ مسئلہ دیرطلب اور پیچیدہ عدالتی نظام میں جا کر نسیاً منسیاً کی طرح ہو جاتا ہے۔ نیز ان واقعات کے اسباب ومحرکات کیا ہیں، ان کے سدباب کے لیے کیا اقدامات کیے جائیں، ان پر غور کرنے کی بظاہر زحمت نہیں گوارا کی جاتی۔

ہمارے نزدیک ان واقعات کا سب سے بڑا محرک مغرب کی اندھی تقلید اور اپنی تہذیب سے اعراض وانحراف ہے، پھر اخلاقی اقدار کا فقدان ستم بالائے ستم ہے۔ مغربی معاشرے نے شرم وحیا کا لباس جو بہت پہلے اتار کر بالکل ننگا اور بے لباس ہو گیا ہے، آج ہم اسی راستے پر آنکھیں بند کر کے بھاگے جا رہے ہیں، اس کے نتائج آنکھوں کے سامنے ہیں۔ گلوبلائزیشن اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کا سیلاب بے حیائی، بے شرمی، بے حجابی اور اخلاقی زوال وانحطاط کے جراثیم کو گھر پہنچانے پر تلا ہوا ہے۔ لباس وپوشاک تبدیل ہو چکے ہیں، جن کپڑوں سے کبھی جسم کو چھپانے اور پردہ پوشی کا کام لیا جاتا تھا، آج اس سے جسم کی ساخت، نشیب وفراز اور اعضاء وجوارح کو نمایاں کرنے پر توجہ مرکوز ہوتی ہے۔ شرم وحیا کی جگہ بے محاباپن نے لے لی ہے، پردہ اب پردہ نہیں رہ گیا ہے، فحش اشتہارات پر کوئی پابندی نہیں ہے، کمپنیاں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے برہنہ سے برہنہ تصاویر شائع کرنے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانا چاہتی ہیں۔ حتی کہ اردو اخبارات اور روزناموں کا ایک بڑا حصہ ایسے اشتہارات پر مشتمل ہوتا ہے، جو جنسی محرکات کو فروغ دینے والے ہوتے ہیں۔

اس صورت حال میں آبروریزی، عصمت دری یا جسم فروشی کے واقعات میں کمی آنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ ناجائز جنسی تعلقات اسی وقت کنٹرول میں آسکتے ہیں، جب ان کے محرکات پر قدغن لگے، لیکن اسباب وعوامل تو موجود ہوں، اور نتائج برآمد نہ ہوں، یہ بالکل غیر منطقی بات ہے۔

ماخوذ: از تفسیر عزیزی

(مسلسل)

تفسیر سورۂ انفطار

بسم الله الرحمن الرحیم

اِذَا السَّمَاءُ انْفَطَرَتْ○

جب آسمان چر جائے

آسمان کے چرنے کی کیفیت یہ ہوگی کہ عرش الٰہی کے نیچے سے بادل کے ٹکڑے کی طرح کوئی چیز گرے گی اس کے شدید ٹکراؤ کی وجہ سے تمام آسمان ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں گے، اور در حقیقت وہ قہرِ الٰہی کی تجلی ہوگی، جب اللہ عزّ وجل اس عالم کے فنا و برباد کر دینے کا ارادہ فرمائیں گے اس وقت وہ تجلیِ قہر اس صورت میں ظاہر ہوگی۔

یہاں بعض ذہین طالب علم سوال کرتے ہیں کہ جب اس عالم کی بنیاد ڈالی تھی تو ابتدا زمین سے ہوئی تھی اب اس کے ختم کر دینے کے وقت ابتداء آسمان سے کیوں ہوئی؟

جواب اس کا یہ ہے کہ جب کسی عمارت کی تعمیر شروع کرتے ہیں تو ابتداء نیچے سے ہوتی ہے، جب اس کو گرایا جاتا ہے تو اس کے اکھیڑنے کی ابتداء چھت سے کی جاتی ہے، اور آسمان بھی اس عالم کا چھت ہے اس لیے فنا کرنے کے لیے ابتداء آسمان سے ہوئی۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ○

اور جب تارے جھڑ پڑیں

آسمان کا چرنا اور ستاروں کا چھٹک کر جھڑنا یہ دو انقلاب جب رونما ہوں گے تو آسمانی نفوس کا تعلق آسمان و ستاروں سے ختم ہو جائے گا، اس تعلق کے ٹوٹ جانے کی وجہ سے ان نفوس کے عقول کا تعلق بھی اپنے نفوس سے منقطع ہو جائے گا، پھر نفوس کے ضمن میں افلاک کے قوائے خیالیہ کا تعلق بھی

اپنے اجرام سے ٹوٹ جائے گا اوران سب کا ربط وتعلق نفوس انسانی سے قائم ہوجائے گا تب ان عقول کا فیضان اورافلاک کی قوائے خیالیہ کی کرشمہ سازیاں سب انسانی نفس کے ساتھ متعلق ہوں گی چنانچہ ان سب اسباب کی وجہ سے نفسِ انسانی کے شعورواحساس میں عظیم وسعت پیدا ہوجائے گی اوروہ "**ما قدمت وما اخرت**" کے معنوں پر سوفیصد مطلع ہوجائے گا یعنی ہر چھوٹی بڑی چیز جواس سے زرزد ہوئی، تمام کلیات وجزئیات جواس نے مقدم کیں یا مؤخران سب پر اس کو کامل اطلاع ہوجائے گی۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ۝

اور جب دریا اُبل نکلیں

یعنی آج جو دریاؤں میں ٹھہراؤ اور سکون ہے وہ باقی نہیں رہے گا بلکہ دریا بہہ نکلیں گے، شیخ ابومنصور ماتریدی رحمہ اللہ تعالی نے فرمایا کہ سب سے پہلے تمام دریا ایک جگہ اکٹھے کیے جائیں گے، ان سب کے جمع ہونے کی وجہ سے پانی میں ایک جوش اور اُبال پیدا ہوگا جس سے ایک شعلہ بلند ہوگا اور سارے سمندر میں آگ لگ جائے گی تب کچھ پانی دھواں بن کر میدانِ قیامت کی ساری فضا کو پُر کردے گا، اور کچھ دوزخ کی آگ بن جائے گا:

"تسجیر بحار" اور "تفجیر بحار" میں فرق:

اس سمندری انقلاب کے دو حصے ہیں ایک ابتداء ہے جب تمام دریا اپنے موجودہ ٹھہراؤ اور سکون سے متغیر ہوکر بہہ نکلیں گے اور دوسرا حصہ جب سب اکٹھے ہوجائیں گے تو جوش واُبال کی شدت کی وجہ سے وہ بھڑک اٹھیں گے، اب یہ سمجھئے کہ سورۂ انفطار میں اس انقلاب کا اول حصہ بیان ہوا کہ جب وہ اُبل کر بہہ پڑیں گے اور ٹھہراؤ اور سکون ان کا ختم ہوجائے گا، اور سورۂ تکویر میں اس انقلاب کا دوسرا اور آخری حصہ بیان ہوا جب وہ سب دریا ایک جگہ جمع ہونے کی وجہ سے بھڑک اٹھیں گے۔

اور دونوں سورتوں میں مقام کی مناسبت سے یہ فرق ہوا ہے اس لیے کہ سورۂ انفطار میں اس کے متصل "**بعثرت القبور**" (قبروں کے کھولے جانے) کا ذکر ہے اس کی مناسبت سے بہہ جانے کو اختیار فرمایا اس لیے کہ جب پانی بہہ کر مکان کی بنیاد میں پہنچ جاتا ہے تو اس کو خراب کردیتا ہے، اور سورۂ تکویر میں "تسعیر جحیم" کی مناسبت سے سمندر کے بھڑکائے جانے کو اختیار فرمایا ہے۔

''بحر'' کی لغوی تحقیق اور سمندروں کا ذکر:

''بحر'' لغت میں سمندر کو کہتے ہیں اور میٹھے دریاؤں کو ''نہر'' کہتے ہیں خواہ کتنے لمبے چوڑے اور گہرے کیوں نہ ہوں، اور سمندر حقیقت میں تو ایک ہے لیکن اس کے مختلف ٹکڑوں اور خلیجوں کی رعایت سے ''بحار'' جمع لائے ہیں، تاریخ دانوں نے لکھا ہے کہ سمندر کے ایک ٹکڑے کا نام ''بحر چین'' ہے، ایک نام ''بحر ہند'' ایک کا نام ''بحر فارس'' ایک کا نام ''بحر روم'' اور ایک ''بحر قلزم'' ہے۔ بحر روم میں فرنگیوں کے جزیرے ہیں اور بحر قلزم عرب وحبشہ کے درمیان بہتا ہے، اسی اور بھی مختلف نام ہیں۔

جب سمندر زمین پر بہہ نکلیں گے تو ان کے بہنے سے (مٹی میں رطوبت و نمی پیدا ہوگی جس کی وجہ سے) انسانی بدن کے مواد اور اس کے بدن کو عذاب و تکلیف دینے کے اسباب میں اضافہ ہوگا، اور نفوسِ سماوی کا تعلق انسانی ابدان کے ساتھ صحیح ہو جائے گا۔

وَاِذَاالْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ○

اور جب قبریں زیروز برکردی جائیں

یعنی قبروں کے مردے اور جو کچھ زمین کے اندر ہے سب الٹ کر زمین کے اوپر آ جائے گا انسانی جوڑوں کے (مٹی میں بکھرے ہوئے) اجزاء آپس میں مل جائیں گے، اس وقت عرش کے نیچے سے ایک ایسا پانی برسے گا جس میں زندگی پیدا کرنے کی قوت ہوگی وہ انسانی منی کی تاثیر رکھے گا، اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں گے تو تمام انسانی روحیں اپنے اپنے بدن کے ساتھ مل جائیں گی اور آسمانی روحیں ان کی خادم و مددگار رہوں گی پھر حشر قائم ہوگا اس وقت ہر نفس کو اپنے اعمال کے متعلق سب کچھ معلوم ہو جائے گا چنانچہ فرمایا:

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَ اَخَّرَتْ○

جان لے ہر ایک جی جو کچھ کہ آگے بھیجا اور پیچھے چھوڑا

یعنی نیکی اور بدی میں سے جو کچھ اللہ تعالی کے پاس آگے بھیجا ہے، اور بھیجنے سے مراد اعمال کا کرنا ہے اس لیے کہ انسان نے جو عمل کیا ہے وہ اعمال نامہ میں لکھ دیا گیا اور وہ اعمال نامے لکھنے والوں

کے واسطے سے اللہ کے دربار میں پہنچے ہیں۔

"وَاَخَّــرَتْ" نیکی اور بدی میں سے جو کچھ پیچھے چھوڑا ہے، پیچھے چھوڑنے سے مراد نہ کرنا ہے، یعنی جو کام اس نے نہیں کیے وہ بھی معلوم ہو جائیں گے، نہ کیے گئے کاموں کو پیچھے چھوڑنے سے اس لیے تعبیر کیا کہ جو کیا نہیں وہ نامۂ اعمال میں لکھا بھی نہیں گیا لہٰذا وہ آگے نہیں پہنچا۔

"ماقدمت"اور"اخرت"میں مفسرین کے اقوال:

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سے مراد مال ہے لہٰذا جو مال اس نے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کی خاطر خرچ کیا ہے وہ سب آخرت میں ذخیرہ ہو گیا ہے (یہ ماقدمت ہے) اور جو مال اس نے خرچ نہیں کیا تو وہ اپنے وارثوں کے لیے پیچھے چھوڑا ہے (یہ ما اخرت ہے)

دوسرا قول: بعض نے کہا ہے کہ "ماقدمت" سے مراد وہ اولاد ہے جو ماں باپ کے سامنے مر گئی، اور "مااخرت" سے مراد وہ اولاد ہے جو انسان کے مرنے کے بعد پیچھے رہی یعنی زندہ رہی۔

تیسرا قول: بعض نے کہا ہے کہ "مــاقـدمـت" سے مراد اول عمر کے اعمال ہیں چاہے وہ اچھے ہوں یا برے، اور "مااخرت" سے آخری عمر کے اعمال مراد ہیں۔

چوتھا قول: بعض نے کہا کہ نیکی یا برائی میں سے کسی کا کرنا یا چھوڑنا یہ سب "مــاقـدمـت" میں داخل ہیں (یعنی ہر وہ عمل جو کرنے والے کی ذات تک محدود ہو چاہے اس کا تعلق کرنے سے ہو یا چھوڑنے سے) اور ایسی رسم، طریقہ، یا مذہب جس کی بنیاد کسی نے ڈالی ہے اور اس طریقہ پر دوسرے لوگ بھی چلے ہیں چاہے وہ رسم وطریقہ اچھا ہو یا برا یہ سب "مااخرت" میں داخل ہیں۔

چنانچہ حدیث میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

"مـا قـدمـت مـن خير أو شر وما اخرت من سنة حسنة استنن بها بعده فله اجـره واجـور مـن اتبـعـه من غير ان ينتقص من اجور هم شئ او سنة سيئة عمل بها بعده فعليه وزره ووزر من عمل بها بعده لا ينتقص من اوزارهم شيئ"

یعنی جو نیکی اور بدی میں سے آگے بھیجا اور جو اچھے طریقے میں سے پیچھے چھوڑا کہ وہ اچھا طریقہ لوگوں نے اس کے بعد اختیار کیا تو اس شخص کے لیے اپنے عمل کا اجر ہے اور ان لوگوں کے اجر سے بھی اس کو ملے گا جنہوں نے اس کے طریقہ کو اپنایا لیکن ان لوگوں کے اجر میں کچھ کمی نہ کی جائے

گی، یا جس نے کوئی برا طریقہ ایجاد کیا کہ اس کے بعد دوسرے لوگوں نے بھی اس کو اختیار کیا تو اس شخص کو اپنے کیے کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے لوگوں نے اس طریق کو اپنایا ان کا گناہ بھی اس پر ہوگا مگر ان کے گناہوں سے ان کے لیے کچھ کمی نہیں کی جائے گی۔

دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ایک مرتبہ ایک حاجت مند شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں آیا اس نے سوال کیا، لوگ خاموش رہے اتنے میں حاضرین میں سے ایک بزرگ اُٹھے اور پہل کرتے ہوئے اس سائل کو کچھ دیا، پھر اس کے بعد سب حسب توفیق اُٹھ اُٹھ کر اس سائل کو دینے لگے، تب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو آدمی کوئی اچھا طریقہ نکالتا ہے پھر اس کے مطابق لوگ عمل کرتے ہیں تو اس پہلے شخص کو اپنے عمل کا بھی ثواب ملتا ہے اور دوسرے لوگوں کے عمل کا ثواب بھی اس کو ملتا ہے لیکن دوسروں کے اپنے ثواب میں کچھ کمی نہیں ہوتی، اسی طرح اگر کوئی بُری رسم نکالتا ہے اور لوگ بھی اس پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو اس اول شخص کو اپنے عمل کا بھی گناہ ہوگا اور جتنے لوگوں نے اس بری رسم کو اختیار کیا ان کا گناہ بھی اس کو ہوگا مگر اس سے خود ان لوگوں کے گناہ میں کچھ کمی نہیں ہوگی۔

اس حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ نے یہ قصہ نقل کرنے کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی ''عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ''

حاصل کلام یہ ہے کہ انسان کو نیکی اور بُرائی کی حقیت وہاں اچھی طرح معلوم ہو جائے گی، جب دیکھے گا کہ نیکی کا بدلہ یہ ہے اور برائی کی سزا یہ ہے یہ بھی دیکھے گا کہ جو اس نے کیا وہ سب بُرا تھا اور جو چھوڑا وہ اچھا تھا، تب اس کو اپنے کیے پر حسرت وندامت ہوگی اس وقت اس سے کہا جائے گا:

یآ اَیُّهَا الاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ۝

اے آدمی کس چیز سے بہکا تو اپنے رب کریم پر

یعنی اے انسان تیرا نام تو انس سے نکالا گیا ہے تو نے یاد حق کے ساتھ انس کیوں حاصل نہ کیا، اور نیکیاں نہیں کیں، تُو حق کے علاوہ جن کے ساتھ مانوس ہوا وہ سب تیرے لیے سانپ وبچھو تھے، تو ہیرے جواہرات اور سونے کے نگینے سمجھ کر ان سے مانوس ہوا اور ان سے محبت کی۔

مَـــا غــرّکَ:- یعنی تجھ کو کس چیز نے فریب دیا، نفس نے، شیطان نے، مخلوق نے، یا دنیا

نے؟

بِـرَبِّکَ الْـکَرِیْمِ:- تیرے ایسے پروردگار سے (کس نے فریب میں ڈالا) کہ جس نے طرح طرح سے تیری پرورش وتربیت کی، اور تیرے ساتھ وہ معاملہ کیا جواس کی صفتِ کریم کا تقاضا تھا، اوراس کے مقابلے میں تُو نے نافرمانی وبغاوت کا دھبہ اپنے اوپر لگایا، تُو نے اپنی وہ بزرگی وعظمت جو تجھے ساری مخلوق پر عطا کی گئی تھی سب برباد کردی۔

"کریم" کے معنی میں علماء کے مختلف اقوال:

(۱) بعض نے کہا کہ کریم وہ ہے جس کا کام ہی انعام واحسان کرنا ہوا اوراس کی ہر حرکت وسکون میں خیر ہی پوشیدہ ہو۔

(۲) بعض نے کہا کریم وہ ہے کہ انعام واحسان کرنے میں جس کے مدنظر نہ تو اپنی ذات کے لیے کوئی نفع حاصل کرنا ہو نہ کسی ضرر کو دفع کرنا۔

(۳) بعض نے کہا کریم وہ ہے جو دوسروں کا حق اپنے ذمہ میں نہ رہنے دے اور اپنا حق دوسروں سے طلب نہ کرے۔

(۴) بعض نے کہا کریم وہ ہے جو دوسروں سے بہت تھوڑی خیر و بھلائی قبول کرنے پر اس کا بدلہ بہت زیادہ دے، اوراللہ تعالیٰ کے کرم کا مقتضا بھی یہی ہے کہ وہ گنہگاروں کے گناہوں کو بخشتا ہے اوراسی پر بس نہیں کرتا بلکہ ان کی تمام تر نافرمانی کے باوجود ان پر مسلسل انعام واحسان بھی کررہا ہے اور گناہوں کی پردہ پوشی بھی فرماتا ہے۔

"ما غرّک بربک الکریم" پر اشکال:

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ یہاں فرمایا رب کریم سے تجھے کس چیز نے غرور وفریب میں ڈالا، گویا کریم سے فریب کھانے پر نکیر فرمائی جارہی ہے کہ کریم سے فریب نہیں کھانا چاہئے تھا، حالانکہ فریب کھانے پر سرزنش کے لیے مناسب یہ تھا کہ صفتِ قہر ذکر فرمائی جاتی اس لیے کہ قہار سے بے خوف ہوجانا اور چھٹکارے کے فریب میں مبتلا ہوجانا واقعی قابلِ مذمت بات ہے، لیکن کریم کا کرم تو بے خوفی کے فریب میں ڈالنے کا خود بڑا سبب ہے، چنانچہ واقعات اس کی گواہی دیتے ہیں۔

تاریخ کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ایک دن نوشیرواں بادشاہ کے دربار میں اس کے دربار کے

لوگ خدام وخواص آپس میں کسی بات پر ہنس پڑے تو ایک وزیر نے کہا تمہیں کچھ خوف نہیں، بادشاہ کے سامنے ایسی حرکتیں کرتے ہو، اس پر نوشیرواں نے کہا کہ ہمیں چاہئے کہ دشمن کو خوف دلائیں نہ یہ کہ اپنے خدمت گاروں کو خوف زدہ رکھیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ایک دن کسی کام کے لیے اپنے غلام کو آواز دی، دو تین بار پکارا مگر اس نے سننے کے باوجود کوئی جواب نہ دیا آپ باہر تشریف لائے دیکھا تو غلام دروازے کے پاس کھڑا ہے آپ نے اس سے پوچھا کیا وجہ ہوئی تم نے جواب نہیں دیا؟ اس نے کہا مجھے آپ کے کرم پر اعتماد تھا کہ آپ سزا نہیں دیں گے، حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا جواب پسند آیا اور اسی وقت اس کو آزاد کر دیا۔

ان دو واقعات سے معلوم ہوا کہ جو چیز (کرم) خود فریب وغرور کا سبب ہو اسی کو فریب کھانے پر مذمت وانکار کے طور پر بیان کرنا کہ اس سے تم نے کیوں فریب کھایا بظاہر مناسب معلوم نہیں ہوتا۔

اشکال مذکور کے جوابات:

(۱) اس جگہ صفتِ کرم فریب کھانے کی وجہ وسبب کے بیان کے لیے ذکر فرمائی ہے کہ اس کے کریم ہونے کی وجہ سے تم دھوکے میں اور غلط فہمی میں پڑ گئے، جب تمہاری نافرمانی کے باوجود اس نے تمہاری پکڑ نہیں کی، لطف وکرم کا معاملہ جاری رہا تو تم مغرور ہو گئے غلط فہمی میں پڑ گئے کہ شاید کبھی بھی ہماری پکڑ نہ ہوگی چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے "**إلٰهي غرَّني حلمك لو أخذتني بالأولى ما جرأت بالثانية**" "الٰہی! تیرے حلم نے مجھے دھوکہ میں ڈالا اگر تو میری پہلی غلطی پر مجھے پکڑ لیتا تو مجھے دوسری کی جرأت نہ ہوتی"

حضرت فضیل بن عیاض رحمہ اللہ سے لوگوں نے پوچھا کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ آپ کو کھڑا کر کے پوچھے "**ما غرك بربك الكريم**" تو آپ کیا جواب دیں گے، انھوں نے فرمایا میں عرض کروں گا "**غرني ستورك المرخاة**" گناہوں کے چھپانے کے لیے تیرے لٹکتے ہوئے پردوں نے مجھے فریب میں مبتلا کیا، یعنی میں نے کتنے گناہ کیے مگر دنیا میں تو نے مجھے رسوا نہیں فرمایا تو میں اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شاید میں کبھی بھی رسوا نہ ہوں گا۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "**كم من مغرور بالستر عليه وكم من مستدرج**

بالاحسان إليه“ بہت سے لوگ پردہ پوشی کی وجہ سے (معافی) کے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں اور بہت سے اللہ کے احسان واکرام کی وجہ سے استدراج میں (یعنی ڈھیل میں) گرفتار ہیں۔

پھر جب مجموعۂ کلام پر استفہام انکار داخل ہوا تو قاعدۂ عربی کے مطابق کلام میں سرزنش وملامت کے معنی پیدا ہوگئے لہٰذا اس غرور پر بھی سرزنش وارد ہوگئی جو کریم کے کرم کو ملاحظہ کرتے ہوئے پیدا ہوگیا تھا، اور جب کرم پر فریب کھانے کی وجہ سے سرزنش ہوگئی حالانکہ کرم فریب میں ڈالنے کا بڑا سبب ہے، تو اس سے مطلق غرور کی نفی بہت اچھی طرح واضح ہوگئی، اس لیے کہ جب کرم غرور کا محل نہیں ہوسکتا تو قہر وغضب غرور کا محل کیسے ہوسکتا ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی صفت جس طرح کرم ہے اسی طرح قہر وغضب بھی اس کی صفت ہے وہ کریم ہے اور قہار ومنتقم بھی، اور ان سب صفات کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے، جب اس کی حکمت کا تقاضا قہر وغضب کا ہوگا تو اس وقت صفت کرم کے آثار ظاہر نہ ہوں گے، اور آخرت میں بدکاروں، گنہگاروں اور نافرمانوں کے ساتھ لطف وکرم حکمت کے خلاف ہے، یہی بات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کو تلاوت کرکے اس موقع پر فرمائی ہے، فرمایا:

”**غره بالله جهله**“ یعنی انسان کو دھوکہ میں ڈالا اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے جہالت نے، انسان صرف ایک صفتِ کرم پر تکیہ لگائے بیٹھا رہا اور اللہ کی دوسری صفات حکمت وعدالت بھول گیا (اگر وہ بھی یاد رہتیں تو مغالطے میں نہ پڑتا)

دوسرا جواب:

کسی کام پر ڈانٹ ڈپٹ وہیں ہوتی ہے جہاں اس کام کے سرزد ہونے کا احتمال ہو، کریم کے کرم سے دھوکہ ہوسکتا ہے لہٰذا اس پر انکار وتوبیخ بھی مناسب ہے لیکن قہر وغضب سے کوئی مغرور نہیں ہوسکتا لہٰذا قاہر کے قہر سے فریب کھانے پر ڈانٹ ڈپٹ کی کوئی مناسبت نہیں ہے مثلاً عرف میں کہتے ہیں فلاں آدمی کے حلم پر بھروسہ نہ کرنا اس کے حلم سے دھوکے وغلط فہمی میں نہ پڑ جانا لیکن یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ فلاں کے غصہ سے غلط فہمی میں نہ پڑنا، اس اعتماد مت کرنا اس لیے کہ قہر وغضب اعتماد کی چیز نہیں بچنے کی چیز ہے ایسے موقع پر بچا جاتا ہے نہ کہ مغالطہ ہوتا ہے۔

تیسرا جواب:

بعض بزرگوں نے ایک اور جواب دیا ہے کہ بندے کو جواب سمجھانے کے لیے صفت کرم

ذکر فرمائی کہ اس کو جواب کی تلقین ہو جائے یعنی جب بندے سے کہا جائے کہ ''رب کریم سے کس نے تمہیں دھوکے میں رکھا'' تو اس کو اس سوال سے ہی جواب سمجھ میں آ جائے اور یوں کہے کہ ''**غـرنـی کرمک**'' میرے رب تیرے کرم نے ہی دھوکے میں ڈال دیا۔

لیکن یہ جواب نہیں چل سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم بھی حکمت سے خالی نہیں ہوتا، اور یہ تو اس کی حکمت کے خلاف ہے کہ بندوں کو بغیر جزا وسزا کے مہمل چھوڑ دے، اس کی حکمت کا تقاضا تو یہ ہے کہ مظلوم کا بدلہ ظالم سے لیا جائے، مخلوق کے حقوق ضائع نہ ہوں، نیکوکار و بدکار کو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مقام دیا جائے، ان کے ساتھ ایک ہی جیسا سلوک نہ کیا جائے تا کہ فرمانبردار اور نافرمان کے درمیان فرق وامتیاز ہو سکے، اس جواب پر تو الٹا بندے کے اوپر الزام آئے گا کہ ارے! تو نے میرے کرم کی آڑ میں میری حکمت کا انکار کر دیا؟

اور حقیقت یہ ہے کہ بندے پر اللہ تعالیٰ کا لطف وکرم اس کی پیدائش سے بھی پہلے جاری ہے، اس کی پیدائش میں نہ اس کی خواہش کا دخل ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کو اس سے کسی بدلے یا غرض کی توقع تھی، پھر طرح طرح کی نعمتوں سے اس کو نوازا، لیکن یہ کوئی ضروری نہیں کہ اللہ کا کرم آئندہ بھی اسی طرح رہے گا، اور گناہوں، نافرمانیوں کے باوجود اس سے کوئی باز پُرس نہ ہوگی اس لیے کہ پہلا کرم دوسرے کرم کا سبب نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کے پہلے کرم پر مغرور ہونے اور مغالطے میں پڑنے کی بجائے زیادہ خوف وڈر پیدا ہونا چاہئے، چونکہ کسی ایسے کی مخالفت کرنا جس کا کوئی احسان نہ ہو زیادہ تعجب خیز نہیں، لیکن احسانات وانعامات سے نوازنے والے ولی نعمت کی مخالفت کرنا تو بہت بڑی ناشکری اور انتہائی خوف وڈر کا مقام ہے، لہٰذا یہ بالکل نامعقول بات ہے کہ پہلے کرم کی بنیاد پر ایسے ناشکرے آدمی سے درگذر کا معاملہ کیا جائے، عرف میں ایسی چشم پوشی کو تو ذلت سمجھا جاتا ہے خاص طور پر اس وقت کہ ایسے کی ناشکری ہو کہ ساری نعمتیں اسی نے دی ہوں اور اس کی نعمتوں کو کسی دوسرے کی طرف منسوب کیا جائے یا اس کی مرضی کے خلاف استعمال کیا جائے۔ العیاذ باللہ۔ جب ایسی چشم پوشی اور معافی کو عرف میں بھی عیب سمجھا جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے اس کی توقع کہاں کی عقلمندی ہے؟ **اعـاذنـا اللہ من ذلک.**

الازہار المربوعہ
(مسلسل)

محدث کبیر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مجیب صاحب نے ذہبی کی عبارت کے بعد مولانا عبدالحی کی بعض عبارات سے بھی ابن اسحاق کا حسن الحدیث ہونا ثابت کیا ہے، مگر مجیب نے یہ نہیں خیال کیا کہ یہ عبارتیں میرے قطعاً خلاف نہیں ہیں تاوقتیکہ وہ یہ نہ ثابت کریں کہ مولانا عبدالحی نے تفرد کی حالت میں ابن اسحاق کو حسن الحدیث کہا ہے۔

صاحب آثار لکھتے ہیں:

''آپ ذہبی کی عبارت **و ما انفرد به ففيه نكارة فان فى حفظه شيئاً** کا ترجمہ یہ کرتے ہیں ''ان کے حافظہ میں کچھ خرابی ضرور ہے اور یہ کہ جس چیز کے روایت کرنے میں وہ تنہا ہوں وہ منکر ہے'' مولف کے ترجمہ کا مطلب یہ ہے کہ ذہبی نے دو مستقل جرحیں کی ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے، جرح صرف یہ ہے کہ ان کے حافظہ میں قدرے خرابی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی حدیث میں کچھ نکارت ہوگئی ہے (آثار ص۴۴ و۴۵)

جواب: – میں نے ذہبی کی عبارت کا ترجمہ نہیں کیا ہے بلکہ اس کا حاصل ذکر کیا ہے، لہذا اس کو ترجمہ کہنا غلط بیانی ہے۔ کیا مجیب صاحب اعلام کے کسی لفظ سے یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ میں نے ترجمہ کیا ہے؟ اسی طرح یہ کہنا کہ ''مولف کے ترجمہ سے ذہبی کا دو مستقل جرحیں کرنا سمجھ میں آتا ہے'' غلط بیانی سے خالی نہیں، اس لیے کہ میری عبارت سے زیادہ سے زیادہ دو جرحیں کرنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ دونوں مستقل ہیں، یا ایک دوسری کا نتیجہ ہے، تو یہ میری عبارت سے نہیں نکلتا۔

اب رہی یہ بحث کہ ذہبی نے دو مستقل جرحیں کی ہیں یا نہیں، تو گذارش ہے کہ جب مجیب صاحب خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ حسب تصریح ذہبی ابن اسحاق کے حافظہ میں خرابی تھی، اور اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ اس کی حدیث میں نکارت ہوگئی، یعنی ابن اسحاق کے حافظہ میں خرابی کا ہونا اوران کی حدیث میں نکارت کا پیدا ہونا دونوں مجیب نے تسلیم کرلیا، تو اب اس بحث سے کچھ حاصل نہیں کہ یہ دونوں مستقل جرحیں ہیں یا ایک جرح دوسری کا نتیجہ ہے۔ چاہے یہ صورت ہو یا وہ صورت، بہرحال جرحیں تو دو ہی ہوں گی۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص نے مسلمان کو گالی دی، اوراس کے بعد شراب نوشی بھی کی۔ یا اس نے شراب پی اور شراب کے نشے میں کسی مسلمان کو گالی دی بہرحال وہ دوگنا ہوں کا مرتکب ہوا اگرچہ پہلی صورت میں سبِّ مسلم شراب نوشی کا نتیجہ نہ تھا، اور دوسری صورت میں سبِّ مسلم شراب نوشی کا نتیجہ تھا۔ حاصل کلام یہ کہ ذہبی کی عبارت میں جو دو باتیں مذکور ہیں وہ دونوں جرحیں ہیں چنانچہ اگر ذہبی نے صرف **ما انفرد ففیه نكارة** کہا ہوتا تو ہر عاقل اس کو جرح سمجھتا۔ اسی طرح صرف **ان فی حفظه شیئا** لکھتے تو اس کو بھی جرح کہنے میں کوئی تامل نہ کرتا۔

باقی رہا مجیب کا یہ لکھنا کہ ''ان کی حدیث میں کچھ نکارت ہوگئی جو حدیث کے قابل احتجاج ہونے میں ذرہ برابر موثر نہیں اسی وجہ سے پہلے ہی حسن الحدیث لکھ دیا'' (ص ۴۵)۔

تو یہ سراسر نافہمی و بے خبری ہے۔ نکارت چاہے تھوڑی ہو یا بہت، حدیث کے قابل احتجاج ہونے میں موثر ہے، اس لیے کہ احکام میں احتجاج صحیح اور حسن میں منحصر ہے [1] اور دونوں کا نکارت سے پاک ہونا ضروری ہے (دیکھو اصول حدیث) اور ذہبی نے جو حسن الحدیث کہا ہے، تو یہ بصورت وجود متابع ہے جیسا کہ میں پہلے بتا چکا۔ مجیب صاحب اس مقام پر اصول حدیث میں حسن کی تعریف غور سے پڑھیں تو ان کو معلوم ہوگا کہ جس راوی کا تفرد منکر سمجھا جاتا ہے اس کی حدیث تاوقتیکہ دوسرے طریق سے بھی مروی نہ ہو حسن نہیں ہوسکتی۔

ناظرین! ابھی میں نے ذہبی کا فیصلہ ذکر کیا ہے جس کو سن کر مجیب صاحب ریشہ خطمی ہوگئے۔ اگر دوسرے محدثین کی سخت سے سخت جرحوں کا بھی ذکر کروں تو خدا جانے ان کا کیا حال ہوگا۔ بہرحال مجیب پہلے ذہبی کے فیصلہ کا جواب دیں اس کے بعد ان کو حوصلہ ہوگا تو دوسری جرحیں بھی ذکر کی جائے گی۔ مجیب ابھی اس کوچہ کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہیں، کچھ اور واقفیت حاصل کرلیں اس کے

(۱) حدیث ضعیف جس کا راوی سیئ الحفظ ہو اس سے بھی احتجاج ہوتا ہے، لیکن اس وقت جب کہ متن حدیث دوسرے طریق سے بھی مروی ہو پس یہاں بھی نکارت دفع ہوگئی ۱۲ منہ

بعد قدم رکھنے کا ارادہ کریں۔

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

دوسرے راوی اس اسناد کے داؤد بن الحصین ہیں، ان میں بھی بہت زیادہ کلام ہے اور محدثین کی ان پر مختلف جرحیں ہیں، اگر ان سب جرحوں سے قطع نظر بھی کرلی جائے تو کم از کم اتنا ضرور کہنا پڑے گا کہ ان کی وہ روایتیں جو عکرمہ سے لاتے ہیں منکر ہوتی ہیں، امام بخاری کے استاذ علی بن المدینی نے فرمایا ہے: **مارواہ عن عکرمۃ فمنکر** یعنی انھوں نے عکرمہ سے جو روایتیں کی ہیں وہ منکر ہیں، اور امام ابوداؤد صاحب سنن کا بھی یہی فیصلہ ہے کہ ان کی اور حدیثیں تو ٹھیک ہیں لیکن، عکرمہ سے جو روایتیں لاتے ہیں وہ منکر ہوتی ہیں (دیکھو میزان ذہبی)۔

اور مسند احمد والی حدیث داؤد نے عکرمہ ہی [سے] سنی ہے اور بیان کی ہے، لہٰذا امام بخاری کے استاذ اور ابوداؤد کے فیصلہ کے مطابق بھی یہ منکر ہے'' (اعلام ص ۱۹)۔

صاحب آثار فرماتے ہیں: یہ بعینہ دوسرا اعتراض ہے الخ (آثار ص ۵۴)

جواب: –میں مجیب کی اس غلط فہمی کا ذکر پہلے کرچکا ہوں اور بتا چکا ہوں کہ ذہبی کا اس حدیث کو مناکیر داؤد میں شمار کرنا اور بات ہے اور ابوداؤد وابن المدینی کا قول اور شے۔ دونوں میں فرق نہ کرنا سخت نافہمی ہے۔

اس کے بعد صاحب آثار نے عمدۃ القاری اور فتح الباری سے یہ دکھایا ہے کہ ''ایک مقام پر عینی وابن حجر نے اسی سند سے ایک دوسری حدیث ذکر کی ہے اور اس کی سند کو حسن کہا ہے'' اس کا ایک جواب بزبان مجیب یہ ہے کہ امام بخاری کے استاذ علی بن المدینی اور امام ابوداؤد کے مقابلہ میں ابن حجر اور عینی کا قول کیا وقعت رکھتا ہے۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ ممکن ہے وہاں ابن حجر اور عینی نے اس سند کی تحسین خارجی وجوہ کی بنا پر کردی ہو (دیکھو آثار ص ۹۳)۔

اس کے بعد صاحب آثار فرماتے ہیں اس اعتراض کا جواب ابن حجر نے فتح الباری میں دیا ہے کہ اس سند والی حدیث سے محدثین نے بہت سے احکام میں احتجاج کیا ہے اور مثال میں ابوالعاص وحضرت زینب والی حدیث کو پیش کیا ہے، (آثار ص ۴۶)۔

جواب: –ابن حجر نے بہت سے احکام میں احتجاج کرنا ہرگز نہیں لکھا ہے، مجیب صاحب

کی یہ صریح غلط بیانی ہے، ابن حجر کا لفظ **فی عدة من الاحکام**، جس کا معنی یہ ہے کہ چند احکام میں احتجاج کیا ہے۔ دوسری غلط بیانی یہ فرمانا ہے کہ ابن حجر نے یہ جواب دیا ہے، حالانکہ ابن حجر نے ہرگز یہ جواب نہیں دیا ہے، بلکہ یہ جواب کسی اور نے دیا ہے جس کو ابن حجر نے نقل کردیا ہے، چنانچہ مجیب نے جو عبارت ابن حجر کی نقل کی ہے اس میں صاف صاف اُجیب کا لفظ ہے، یعنی جواب دیا گیا ہے۔ پس خود مجیب ہی کی زبانی میں کہتا ہوں کہ فتح الباری میں اس جواب کے موجود ہونے اور ابن حجر کے اس جواب کو نقل کرنے سے یہ کیا ضرور ہے کہ ابن حجر اس کے قائل ہی ہوں؟ (دیکھو آثار ص ۴۲)

مجیب کی ان غلط بیانیوں کو ظاہر کرنے کے بعد ان کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ جواب درحقیقت ابن القیم کا ہے، جس کو ابن حجر نے نقل کردیا ہے، اور یہاں پر اگرچہ اس جواب کی نسبت انھوں نے کچھ نہیں لکھا ہے، لیکن فتح الباری ج ۹ ص ۳۴۲ اور ج ۹ ص ۳۴۳ میں جو کچھ انھوں نے لکھا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ جو حدیث مثال میں پیش کی گئی ہے اس کی طرف ائمہ اربعہ میں سے کوئی نہیں گیا ہے، اور ابن عبدالبر مالکی، بیہقی شافعی، اور طحاوی حنفی ہر ایک نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس حدیث کا جواب دیا ہے، اور خود ابن حجر نے بھی اس کی تاویل کی ہے۔

اب ناظرین غور کریں کہ اگر اس حدیث سے احتجاج کیا گیا ہوتا تو اس کی تاویل کرنے اور اس کا جواب دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اور اسی مقام پر فتح الباری میں خطابی کا یہ قول بھی منقول ہے **هذه نسخة ضعفها علی بن المدینی وغیره من علماء الحدیث (یعنی ابن اسحق عن داؤد بن الحصین عن عکرمة** ایک ایسا نسخہ ہے جس کو ابن المدینی اور ان کے علاوہ دوسرے علماء حدیث نے ضعیف قرار دیا ہے) یعنی میں نے جو بات ابن المدینی وامام ابوداؤد کے نام سے ذکر کی ہے وہ فتح الباری میں بھی بلا رد وقدح مذکور ہے، اور اسی بات کو شوکانی نے بطور خود نیل الاوطار ۶ ص ۷۷ میں لکھا ہے اور اس پر کوئی کلام نہیں کیا ہے، اور یہ بھی فرمایا ہے کہ ابن اسحاق میں مشہور کلام ہے۔ اس سے میرا منشا یہ ہے کہ اولاً تو اس اسناد سے احتجاج کرنا ثابت نہیں ہوتا اور اگر کسی نے احتجاج کیا ہے تو وہ جواب دہ ہے کہ ابن المدینی اور دوسرے علماء حدیث نے جب اس سلسلہ اسناد کی تضعیف کی ہے تو وہ کس حجت سے ان کی مخالفت کرتا ہے، اور سب سے اقل درجہ میں یہ گزارش ہے کہ جب ابن حجر نے احتجاج کرنا بھی نقل کیا اور اس سند کا ضعیف ہونا بھی تو حسب قاعدہ **الجرح مقدم علی التعدیل** (یعنی جرح تعدیل پر مقدم ہے) اس کی تضعیف مقدم ہوگی۔ اور اگر مجیب صاحب اس کو

تسلیم نہ کریں تو کم از کم تعارض کی وجہ سے کوئی بات قابل تمسک نہیں۔اسی سے ذہبی کی تصحیح کا جواب بھی ہوگیا کہ جب ذہبی ابوالعاص والی حدیث کو میزان میں بسلسلۂ مناکیر داؤد لکھتے ہیں اور تلخیص میں اس کی تصحیح کرتے ہیں، تو اس حدیث کا منکر ہونا راجح ومقدم ہوگا۔اور اگر مجیب صاحب کی تقدیم پر رضامند نہ ہوں گے، تو تعارض کی وجہ سے ہر ایک بات کو نا قابل قبول کہنا پڑے گا۔اگر مجیب صاحب اسی صورت کو قبول کرتے ہیں اور ذہبی کی تصحیح جو انھوں نے نقل کی ہے اس کو واپس لیتے ہیں تو صاف صاف لکھیں۔

اب رہا مجیب صاحب کا ابن المدینی وابوداؤد کے جواب میں یہ فرمانا کہ ''یہاں منکر بھی مجروح وضعیف نہیں بلکہ منفرد اور صحیح کے معنی میں ہے'' (آثار ص ۴۶) تو اس کا جواب بار بار دیا جاچکا اور یہاں تو اور بھی اس جواب کا امکان نہیں ہے، اس لیے کہ ابوداؤد کا کلام میزان میں یوں مذکور ہے: **أحاديثه عن عكرمة مناكير وأحاديثه عن شيوخه مستقيمة** یعنی عکرمہ سے ان کی حدیثیں منکر ہیں اور (دوسرے) شیوخ سے ان کی حدیثیں ٹھیک ہیں۔اب بتائیے کہ اگر یہاں منکر بمعنی صحیح ہے تو پھر عکرمہ اور دوسرے شیوخ میں تفریق کی کیا وجہ ہے؟ اور اس تطویل لا طائل سے کیا فائدہ تھا؟ بات یہ ہے کہ مجیب صاحب دوسروں کی تقلید میں بے سوچے سمجھے جو چاہتے ہیں لکھ دیتے ہیں، اسی طرح ابن المدینی کے کلام کا بھی یہ معنی نہیں ہوسکتا، چنانچہ اسی لیے خطابی اور شوکانی نے **ضعفها علي** یا **ضعف أمرها علي** (یعنی ابن المدینی اس کو ضعیف کہا ہے) لکھا ہے۔

اس کے بعد مجیب نے حدیث ابوالعاص پر ابوداؤد کے سکوت سے اس کی سند کے صالح ہونے پر استدلال کیا ہے۔اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو آپ کے فاضل ربانی علامہ امیر یمانی نے اس قاعدہ کو غلط قرار دے دیا ہے، تحفہ مرضیہ ص ۲۷۲ تا ۲۷۴ میں جو طویل عبارت ان کی نقل کی گئی ہے، اس میں بتصریح موجود ہے: **والصواب عدم الاعتماد على مجرد سكوته.** یعنی صواب یہ ہے کہ ابوداؤد کے سکوت پر اعتماد نہیں ہے۔

ثانیاً: – اس قاعدہ کو صحیح بھی مان لیا جائے تو یہ اس وقت مفید ہوگا جب ابوداؤد کے تمام نسخوں کو جو ابوداؤد کے مختلف شاگردوں کی روایت سے ہیں دیکھ کر کر سکوت کا ثبوت ہوجائے، جیسا کہ اسی تحفہ مرضیہ میں مصرح ہے اور امیر یمانی کے کلام میں بھی اس کا اشارہ ہے۔

ثالثاً:- صالح کے یہ معنی متعین نہیں ہیں کہ وہ لائق احتجاج ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس کا معنی یہ ہو کہ استشہاد ومتابعت کے لائق ہیں، جیسا کہ امیر یمانی کی اسی عبارت میں یہ بھی ہے۔

رابعاً:- ابن حجر وغیرہ نے جو عبارت ابوداوٗد کی نقل کی ہے اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس حدیث میں تھوڑا ضعف ہے اس کو انھوں نے نہیں بیان کیا ہے، یعنی ان حدیثوں پر بھی سکوت کیا ہے جن میں کم ضعف ہے، پس اس سے بھی تیسرے جواب کی تائید ہوتی ہے۔

خامساً:- یہ سخت حیرت کی بات ہے کہ اپنے مطلب کی حدیث ہو تو ابوداوٗد کے سکوت سے اس کی صلاحیت ثابت کرنے کی کوشش کی جائے اور اپنے مطلب کے خلاف ہو تو ابوداوٗد کی صریح تصحیح بھی درخور اعتنا نہ ہو۔

ناظرین کو یاد ہوگا کہ ابوداوٗد نے حدیث رکانہ کی صاف لفظوں میں تصحیح کی ہے، مگر مجیب صاحب کے نزدیک قابل قبول نہیں ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مسند احمد والی حدیث کسی طرح بھی قابل احتجاج نہیں ہے۔ اور مجیب صاحب نے جتنا زور اس کو صحیح ثابت کرنے کے لیے صرف کیا ہے سب مذہبی تعصب اور کوتاہ نظری کا نتیجہ ہے۔

حدیث بتہ پر بحث

میں نے اعلام میں لکھا تھا:

کہ حضرت رکانہ کے واقعۂ طلاق کے متعلق دو روایتیں کتابوں میں ملتی ہیں، ایک روایت خود رکانہ سے مروی ہے جو باب اول میں آچکی ہے، دوسری روایت حضرت ابن عباس سے اور وہی اس وقت زیر بحث ہے۔ حضرت رکانہ کی روایت کے جملہ طرق میں یہ مذکور ہے کہ انھوں نے لفظ بتہ سے طلاق دی، اور حضرت ابن عباس کی روایت میں یہ ذکر ہے کہ رکانہ نے تین طلاقیں دیں، ان دونوں مختلف ومتضاد باتوں میں اجلۂ محدثین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت رکانہ نے لفظ بتہ سے طلاق دی ہے (اعلام ص۱۹)۔

صاحب آثار لکھتے ہیں: مؤلف نے اپنے رسالہ ص ۸ وص۹ میں بتہ والی حدیث کی دو سندیں لکھی ہیں (الی) ان میں روایت ثانی تو یقیناً رکانہ سے مروی نہیں ہے۔ اور پہلی میں اختلاف

ہے کہ رکانہ سے مروی ہے یا نہیں۔ابن حجر کی عبارت تلخیص سے نقل کر چکا ہوں **واختلفوا هل هو من مسند ركانة أو مرسل عنه.** یعنی محدثین کا اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا یہ حدیث بتہ مسند رکانہ سے ہے یا مرسل ہے (آثار ص ۴۷)

جواب:- سب سے پہلی گزارش یہ ہے کہ جب محدثین کا اختلاف ہے کہ یہ حدیث مسند رکانہ سے ہے یا مرسل ہے، یعنی کوئی محدث اس کو مسند رکانہ سے مانتا ہے اور کوئی مرسل، تو آپ نے اس پر غلط بیانی کا عنوان کیوں قائم کیا ہے؟ ناظرین اس سے سمجھ سکتے ہیں کہ مجیب نے غلط بیانی کے جو عنوان قائم کیے ہیں ان کا کیا حال ہے۔اس کے بعد عرض ہے کہ اگر روایت ثانی سے مراد **نافع بن عجیر** کا طریق ہے تو یہ کہنا کہ ''وہ یقیناً رکانہ سے مروی نہیں ہے'' بالکل غلط ہے۔اس لیے کہ ابوداؤد ودارقطنی میں **نافع بن عجير عن ركانة** کی تصریح موجود ہے، اور اگر روایت ثانی سے حضرت ابن عباس کی روایت مراد ہے تو اس کو رکانہ کی روایت کہا کس نے جو آپ اس زور میں تردید فرما رہے ہیں، اس کو تو میں خود حضرت ابن عباس کی روایت کہہ رہا ہوں۔اب رہی یہ بات کہ پہلی میں اختلاف ہے کہ رکانہ سے مروی ہے یا نہیں۔تو پہلی سے آپ کی مراد چاہے حدیث بتہ بہمہ طرق ہو یا صرف زبیر ابن سعید کا طریق، بہرحال آپ کا یہ کلام سراسر نادانی ہے۔

اولاً:- اس لیے کہ اس حدیث کے دو طریق ہیں: ایک نافع کا اس کی نسبت میں بتا چکا کہ ابوداؤد اور دارقطنی نیز مسند طیالسی وغیرہ میں **نافع بن عجير عن ركانة** کی تصریح موجود ہے۔اور دوسرا طریق زبیر بن سعید کا ہے اس میں **عبدالله بن علي بن يزيد عن أبيه عن جده قال أتيت النبي ﷺ فقلت يا رسول الله اني طلقت إمرأتي البتة** واقع ہوا ہے اور مولانا عبدالرحمٰن صاحب مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی ج ۲ ص ۲۱۰ میں صاف لکھا ہے **عن جده أي ركانة** الخ یعنی **جده** سے مراد رکانہ ہیں۔اب پوری عبارت کا ترجمہ یہ ہوا کہ عبداللہ نے اپنے باپ علی سے اور علی نے اپنے دادا یا عبداللہ کے جد بعید رکانہ سے روایت کی، رکانہ نے بیان کیا کہ میں نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے اپنی بی بی کو بتہ طلاق دیدی الخ۔مجیب صاحب کو اپنے گھر کے اس فیصلہ سے خوش ہونا چاہئے اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا چاہئے، کیوں کہ مولانا مبارک پوری نے صاف بتادیا کہ **جده** سے مراد حضرت رکانہ ہیں اور انہیں نے اپنی

طلاق کا واقعہ بیان کیا ہے، لہٰذا یہ حدیث انہیں سے مروی ہوئی۔ مولانا مبارک پوری نے اس سے پہلے یہ بھی بتایا ہے کہ ذہبی نے بھی جدہ سے مراد حضرت رکانہ کو قرار دیا ہے۔ حاصل یہ کہ حسب تصریح ذہبی ومبارک پوری زبیر بن سعید کے طریق کا بھی حضرت رکانہ سے مروی ہوتا ثابت ہے۔ اس کے علاوہ ترمذی میں مصرح ہے کہ طلاق دینے والے نے خود اپنا قصہ بیان کیا۔ اور بالکل کھلی ہوئی بات ہے کہ طلاق دینے والے حضرت رکانہ ہیں، پس کسی کا خواہ مخواہ یہ کہہ دینا کہ رکانہ نے بیان نہیں کیا قطعاً ناقابل التفات ہے، بالخصوص جب کہ اس قائل کی شخصیت بالکل مجہول ہو۔ اگر مجیب صاحب کچھ دعویٰ رکھتے ہوں تو بتائیں کہ کس نے اس حدیث کو رکانہ سے مروی ہونے کا انکار کیا ہے اور اس کی کیا دلیل ہے۔

ثانیاً:- امام ابوداؤد وطیالسی نے حدیث بتہ کو مسند رکانہ میں ذکر کیا ہے، پس ان کے نزدیک بھی یہ حضرت رکانہ ہی سے مروی ٹھہری۔ اب مجیب کا فرض ہے کہ جس طرح میں نے طیالسی، ذہبی، مولانا مبارک پوری کے کلام سے حدیث بتہ کا حضرت رکانہ سے مروی ہونا ثابت کیا ہے وہ بھی کسی محدث کا نام لے کر اس سے انکار کرنا بیان کریں۔

ثالثاً:- مولوی شمس الحق صاحب کی تعلیق مغنی سے ظاہر ہوتا ہے کہ انھوں نے ابن حجر کے مذکورہ بالا فقرہ کو صرف نافع کے طریق کے ساتھ مخصوص مانا ہے، پس اس صورت میں زبیر بن سعید کا طریق بے اختلاف مسند ہوگا اور ایک طریق کا بھی بے اختلاف مسند ہونا میری صداقت اور مجیب کی غلط بیانی کی کافی دلیل ہے۔

رابعاً:- مولانا سہارنپوری کی جو عبارت مجیب نے نقل کی ہے اور اس کو میرے گھر کا فیصلہ کہا ہے وہ بھی صرف ایک طریق یعنی طریق زبیر کے ساتھ مخصوص ہے۔ پس اگر مولانا کے کلام کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو صرف زبیر کے طریق کے موصول ومرسل ہونے میں تردد ہوگا، لیکن نافع کا طریق بالکل بے داغ رہے گا، چنانچہ اسی وجہ سے مولانا نے اس طریق کے موصول ومسند ہونے میں کوئی تردد ظاہر نہیں کیا ہے (دیکھو بذل المجہود ج۳ ص۷۶) پس اس صورت میں بھی میرا دعویٰ بالکل درست ہے اور زبیر کے طریق کی تخصیص کیے بغیر مولانا سہارنپوری کا کلام نقل کرنا ابلہ فریبی وغلط بیانی سے خالی نہیں ہے۔

خامساً:- اس حدیث کے حضرت رکانہ سے مروی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ اگر

زبیر کے طریق میں جدہ سے مراد یزید بن رکانہ ہوتے تو رجال ستہ میں ان کا ذکر ضروری تھا، حالانکہ تقریب، تہذیب اور خلاصہ کسی میں بھی یزید کا ذکر نہیں۔ پس معلوم ہوا کہ جدہ سے یزید مراد نہیں ہیں بلکہ رکانہ ہیں اور یہ حدیث رکانہ ہی سے مروی ہے۔

سادساً: -مستدرک حاکم میں عن جده ركانة بن عبد يزيد کی تصریح موجود ہے۔

سابعاً: -ابن القیم نے اغاثہ میں اس حدیث کی نسبت لکھا ہے کہ ابوداؤد وابن ماجہ نے اس کو رکانہ سے روایت کیا ہے۔

ثامناً: - حافظ ابن حجر نے اصابہ میں ابویعلی وبغوی وابن شاہین وابن مندہ کے حوالہ سے زبیر کا طریق نقل کر کے فرمایا ہے کہ صاحب واقعہ رکانہ ہیں اور جدہ کی ضمیر عبداللہ کی طرف نہیں لوٹتی ہے، بلکہ علی کی طرف لوٹتی ہے، پس مطلب یہ ہوا کہ عبداللہ نے اپنے باپ علی سے اور علی نے اپنے دادا رکانہ سے روایت کی رکانہ نے کہا کہ میں نے طلاق دی الخ۔

تاسعاً: -صاحب مشکوٰۃ نے اس حدیث کو حضرت رکانہ ہی کی روایت سے نقل کیا ہے لکھتے ہیں عن ركانة بن عبد يزيد انه طلق الخ۔

عاشراً: -امام مزی نے تحفۃ الاشراف [1] میں لکھا ہے کہ من مسند ركانة عن النبي ﷺ وفي الطلاق اور اس کے بعد یہی حدیث ذکر کی ہے۔

اب رہا یہ شبہہ کہ مولانا سہارنپوری نے زبیر کے طریق کی نسبت یہ لکھا ہے کہ ''اگر جد سے مراد رکانہ ہوں تو روایت مرسل ہوگی'' یہ اس خیال کی بنا پر لکھ دیا ہے کہ علی نے اپنے دادا رکانہ سے روایت نہیں کی لیکن مولانا مبارکپوری نے لکھا ہے کہ علی نے اپنے دادا رکانہ سے بھی روایت کی ہے (تحفۃ الاحوذی [2] ص ۲۱۰)۔

پس یہ روایت مرسل نہیں ہوسکتی تا وقتیکہ یہ نہ ثابت کیا جائے کہ علی کا سماع اپنے دادا سے ناممکن ہے، اور اگر بالفرض یہ طریق مرسل بھی ہو تو نافع کے طریق کے موصول ہونے میں کوئی شبہہ

---

(۱) تحفۃ الاشراف کا قلمی نسخہ پٹنہ لائبریری میں میں نے بچشم خود دیکھا ہے اور اسی سے یہ عبارت نقل کی ہے ۱۲ منہ

(۲) اس کی تصریح اصابہ ص ۵۲۱ جلد ۱، اور خلاصہ میں بھی ہے، نیز کاشف میں ذہبی نے لکھا ہے: عن أبيه وجده وعنه ابناه. کاشف کی یہ عبارت پٹنہ کے قلمی نسخہ سے میں نے نقل کی ہے ۱۲ منہ۔

نہیں، اس لیے کہ نافع کے طریق میں اولاً تو عن رکانۃ کی تصریح موجود ہے اور اس پر کئی ثقہ متفق ہیں، پس اس طریق کے مقبول ہونے میں تامل نہیں ہوسکتا، اور اس موصول کی تائید سے زبیر کا مرسل طریق بھی بالاتفاق حجت ہوجائے گا۔

ثانیاً:- نافع کو ابن حبان، بغوی، ابونعیم اور ابوموسیٰ وغیرہ نے صحابہ میں ذکر کیا ہے، پس اگر انھوں نے عن رکانۃ نہ بھی کہا ہو اور واقعہ میں بھی موجود نہ ہوں تو بھی زیادہ سے زیادہ ان کا طریق مرسل صحابی ہوگا اور مرسل صحابی بالاتفاق حجت ہے اور اس کی تائید سے زبیر کا مرسل طریق بالاتفاق حجت ہوجائے گا۔

بہرحال حدیث بتہ کو حضرت رکانہ سے مروی کہنا کسی طرح بھی غلط نہیں ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆

صفحہ ۲۷ کا بقیہ

نیز بعض روایات میں معقل کے قصہ میں اتنا اور مروی ہے: **فلما سمعها معقل قال سمعاً لربی وطاعة ثم دعاه (زوج اختہ) وقال أزوجک وأكرمک** (لباب النقول) یعنی جب یہ آیت اتری، تو معقل نے کہا **سمعاً لربی وطاعة** (میں خدا کی سنتا ہوں اور اس کی اطاعت کرتا ہوں) پھر اپنے پُرانے بہنوئی کو بُلایا، اور کہا کہ میں تم سے اس کا نکاح کرتا ہوں، اور تمہاری تکریم کرتا ہوں، اس سے جو مطلب ثابت ہوتا ہے، وہ بالکل کھلا ہوا ہے۔

''تین دفعہ طلاق ایک ایک کر کے مختلف وقتوں میں حسب ضرورت دینی چاہئے، نہ کہ ایک دفعہ تین طلاق یا ایک عدت (تین قروء) میں تین طلاق۔''

بیشک ایسا ہی کرنا چاہئے، لیکن اگر کوئی ایک ہی دفعہ تینوں طلاقیں دے دے، تو کیا ہو؟ ایسی صورت میں علمائے حنفیہ یہ کہتے ہیں، کہ واقع ہوجائیں گی۔ اور واقع ہوجانے کی دلیلیں چوتھے نمبر کے جواب میں مذکور ہیں۔

مسئلہ طلاق پر شبہات

اوران کا ازالہ

از: حضرت محدث کبیرؒ

[حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کی درج ذیل تحریر امرتسر سے شائع ہونے والے رسالہ ''القاسم'' میں ۲۵؍اپریل ۱۹۲۴ء کے شمارہ میں شائع ہوئی تھی، اب ناظرین المآثر کی خدمت میں پیش ہے (ادارہ)]

''القاسم'' مورخہ ۲۵ مارچ ۱۹۲۴ء میں کسی صاحب نے مسئلۂ طلاق کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا ہے اوراس کی طرف علماء کوتوجہ دلائی ہے، بعض حضرات نے مجھ کو خاص طور سے لکھا، کہ تم اس کی طرف توجہ کرو، امتثالاً للامر یہ چند سطریں حوالۂ قلم کی جاتی ہیں۔

مضمون نگار نے اپنے مضمون کا خلاصہ چار نمبروں میں بیان کیا ہے۔ پہلا نمبر بالکل صحیح ہے، اس سے تعرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ بقیہ نمبر نقل کر کے مضمون نگار کے شبہات وشکوک کا ازالہ کیا جاتا ہے:

''(۲) عدت کے بعد نکاح نہیں کرسکتا، اور طلاق بائن ہوجائے گی''۔

یہ درحقیقت خلاصہ ہے مضمون نگار کی اس تقریر کا جوانھوں نے **وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ** کی تفسیر میں کی ہے، آپ کی وہ تقریر یہ ہے: ''اس قدر تو سب کے نزدیک مسلم ہے، کہ **طلقتم** میں شوہروں کی طرف خطاب ہے، اور جب یہ مسلم ہے، تو ضرور ہے، کہ **تعضلوهن** میں بھی انہی کی طرف خطاب ہو، ورنہ عبارت بالکل بے ربط ہوجائے گی، کیونکہ اس تقدیر پر آیت کا ترجمہ یہ ہوگا، کہ اے شوہرو! جب تم عورتوں کو طلاق دو اور وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں، تو اے نکاح کے اولیاء تم ان کو نکاح سے نہ روکو، اس عبارت کی بے ربطی میں کوئی شبہہ نہیں، شرط میں تو شوہروں سے خطاب ہوا، اور جزا میں ان سے کچھ واسطہ نہ رہے، اور اولیاء

نکاح سے تخاطب کیا جائے، امام رازی نے باوجودے کہ شافعی ہیں تفسیر کبیر میں صاف لکھا ہے، کہ یہ معنی غلط ہیں، (الی قولہ) امام حنفیہؒ نے اس آیت کے یہی معنی [۱] لیے ہیں۔ امام شافعی نے جو معقل ابن یسار کا قصہ اس آیت پر چسپاں [۲] کیا ہے، اس میں تامل ہے۔

میں کہتا ہوں، کہ اتنی بات تو بالکل مسلم ہے، کہ بدون حذف وتقدیر کے پہلی تفسیر کی بنا پر آیت میں گونہ بے ربطی ہے۔ مگر جن لوگوں نے آیت کا یہ مطلب بیان کیا ہے، انھوں نے تقدیرات ذکر کر کے بے ربطی کو دفع کر دیا ہے، اور وہ اس پر مجبور اس لیے ہوئے، کہ بخاری وغیرہ کی روایت سے اس آیت کا نزول معقل بن یسا کے بارے میں متعین ہے، تو انھوں نے معقل کے حسب حال آیت کے معنی بیان کیے، اور ایسی دشواریوں کے وقت محذوفات ومقدرات کی تقدیر کوئی مستنکر بات نہیں **کما لایخفی علی الماهرین** ۔ میں نہایت متحیر ہوں، کہ امام رازی نے اس معنی کو غلط کیوں قرار دیا! جب کہ صحیح بخاری وترمذی وابوداوٗد میں صاف طور پر موجود ہے، کہ یہ آیت معقل ابن یسار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اور مصنفین اسباب النزول نے اسی معقل کے واقعہ کو اس آیت کا سبب نزول ذکر کیا ہے، دیکھو لباب النقول وغیرہ۔ شاہ ولی اللہ صاحب محدث نے فتح الخبیر میں محدثین کی صحیح ترین تفسیرات سے اسباب نزول نقل فرنے کا التزام کیا ہے، اور وہ بھی اس آیت کا سبب نزول یہی لکھتے ہیں: **كانت أخت معقل بن يسار طلقها زوجها فتركها حتى انقضت عدتها فخطبها فأبى معقل فنزلت فلا تعضلوهن** [۳] الخ۔ اور اگر آیت کے وہ معنی نہ کیے جائیں، جو معقل بن یسار کے حسب حال ہے، تو بھی انشاء اللہ کوئی حرج نہیں۔ اصل مسئلہ دوسری آیتوں کو یکجا کر کے غور کرنے سے یہی ثابت ہوتا ہے، مگر اس کے لیے چند مقدمات سمجھنے چاہئیں۔

۱:- دو طلاقوں تک اختیار رجعت رہتا ہے، قال اللّٰہ تعالیٰ: **اَلطَّلَاقُ مَرَّتَانِ فَاِمْسَاكٌ**

---

(۱) امام الحنفیہ کا قول کسی مستند کتاب سے نقل کرنا چاہیے

(۲) گستاخانہ کلام ہے، امام شافعی نے نہیں چسپاں کیا ہے، بخاری وغیرہ میں موجود ہے، اور تامل کیوں ہے، وجہ لکھنی چاہیے۔۱۲

(۳) علاوہ ازیں بعض مفسرین نے انتشار ضمائر کے دفع کے خیال سے دو جگہوں میں **الناس** کو مخاطب بنایا ہے۔ اس تفسیر کی بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا: اور جب تم میں ایسے لوگ پائے جائیں، کہ وہ اپنی بیبیوں کو طلاق دیدیں۔ پھر وہ عورتیں اپنی میعاد پوری کرلیں، تو تم اُن کو اس سے مت روکو کہ وہ اپنے شوہروں سے نکاح کرلیں، **وقيل انه خطاب للناس اى لايوجد فيما بينكم عضل من المراجعة أى الازواج وانهم وان لم يكونو عاضلين حقيقة لكن لما وجد العضل فيما بينهم وهم راضون به جعلوا بمنزلة العاضلين وخوطبوا بالنهى الخ (تفسير أحمدى) وهكذا يفهم من الكشاف ٢**

بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ.

۲:- رجعت کی حقیقت یہ ہے کہ زوجین کا اس حالت کی طرف عود کرنا جس میں نکاح کے منافع کا ترتب ہو، اور علاقہ زوجیت جس میں اب ذرا نقص پیدا ہو گیا ہے، صحیح اور اصلی حالت پر آ جائے، نہ کہ علاقہ کی تجدید و تبدیل۔ اس معنی پر ''امساک'' کا لفظ دلالت کرتا ہے، روک رکھنا بتلاتا ہے، کہ ابھی انقطاع نہیں ہوا ہے۔ اور ''تسریح'' کا لفظ بھی بتلاتا ہے، کہ ابھی کچھ علاقہ ہے۔ ورنہ چھوڑنا اور رخصت کرنا چہ معنی!

۳:- علاقہ نکاح کا قطع و وصل کے قابل ہونے اور ان دونوں کے ساتھ عدم اتصاف بالفعل کی حالت عدت تک رہتی ہے، اس کے بعد نہیں۔ **ولا تعزموا عقدة النكاح حتى يبلغ الكتاب اجله.** یعنی معتدہ سے نکاح کا عزم مصمم نہ کرلو، جب تک کہ عدت نہ گزر جائے۔ (اس لیے کہ بعض صور میں علاقہ نکاح ابھی اس قابل ہے، کہ اپنی اصلی حالت کی طرف عود کر جائے پھر جب اس قابل نہ رہے گا، تو جو چاہو، کرنا) اور اسی وجہ سے فرمایا: **فَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ . الآية،** مضمون نگار نے جو معنی بیان کیے ہیں، وہی معنی کیے جائیں، جب وہ مطلب ثابت ہوتا ہے یعنی **لاتعضلوهن** میں شوہروں ہی سے خطاب مانا جائے، میرا مطلب یہ ہے، کہ شوہروں کو بھی عضل (روک دینے) سے روکا جا رہا ہے۔ تو بلوغ اجل (انقضائے عدت) کے بعد۔ معلوم ہوا کہ عدت کے اندر اندر روکیں، تو حرج نہیں۔

۴:- مضیِ عدت (عدت گزر جانے) کے بعد نکاح باقی نہیں رہتا، اور یہ تعلق منقطع ہو جاتا ہے، بی بی، بی بی ہونے سے اور شوہر شوہر ہونے سے نکل جاتا ہے۔ اس کی دلیل بھی **فلا تعضلوهن** ہی ہے۔ بنا بر تفسیر مضمون نگار کیونکر یہ مطلب ہوا، کہ اے شوہر و اپنے مطلقات کو دوسرے شوہر کرنے سے نہ روکو۔ معلوم ہوا کہ عدت کے بعد اس کا اختیار نہیں۔

۵:- دوسرے طلاق کی عدت گزر جانے کے بعد حلالہ وغیرہ کا حکم قرآن نے نہیں دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ دو طلاقوں سے ایسی حرمت نہیں ہو جاتی، جیسی کہ تین سے یعنی ایسی کہ تحلیل کی ضرورت ہو۔

۶:- تیسری طلاق کے بعد تحلیل کا حکم فرمایا گیا۔ ارشاد ہوتا ہے: **فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ**

مِنْ بَعْدِ حَتّیٰ تَنْکِحَ زَوْجاً غَیْرَہٗ. اس کاتعلق الطلاق مرتان سے ہے۔دونوں کو یکجا کرنے کے بعد مطلب یہ ہوتا ہے کہ طلاق دو بار ہے، دو بار کے بعد خیر وخوبی سے بی بی کو روک رکھے، یا خوش اسلوبی وسلوک کے ساتھ رخصت کردے، ان دونوں صورتوں میں سے کسی نے پہلی اختیار کی، جب تو کوئی بات نہیں، اور اگر رخصت ہی کردیا، تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہوسکتی، تاوقتیکہ وہ دوسرے شوہر سے عقد نہ کرے، یعنی صرف تیسری طلاق کے بعد ایسی حرمت پیدا ہوجاتی ہے کہ بدون تحلیل کے زائل نہیں ہوسکتی۔

ان سب نمبروں کا خلاصہ یہ ہوا کہ دو طلاق کے بعد رجعت ہوسکتی ہے۔

رجعت عدت کے اندر ہوگی، عدت کے اندر علاقہ نکاح نقص کے ساتھ کچھ رہ جاتا ہے، اسی وجہ سے نکاح کی ضرورت نہیں۔

دو طلاقوں سے حرمت غلیظہ پیدا نہیں ہوتی، جس کے بعد بدون تحلیل نکاح نہیں ہوسکتا ہے۔

صرف تیسری ہی طلاق کے بعد حرمت غلیظہ ہوا کرتی ہے۔

ان سب پر غائر نظر ڈالنے والا اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے: دو طلاقوں کے بعد جب عدت گزر گئی، تو وصلۂ نکاح باقی نہیں رہا پھر بھی تین کی طرح حرمت غلیظہ کا ثبوت بھی نہیں ہوا۔اس لیے بدون تحلیل تجدید نکاح سے وہ عورت مطلق پر حلال ہوسکتی ہے۔الغرض قرآن نے صرف تیسری دفعہ کے بعد نکاح کرنا ناجائز بتایا ہے۔اگر پہلی دونوں کا بھی یہی حال ہوتا، تو ضرور بیان ہوتا۔

ان سب سے قطع نظر کرتے ہوئے خود مضمون نگار سے سوال ہے، کہ انھوں نے یہ نتیجہ کہاں سے اخذ کیا ہے؟ اگر **اذا طلقتم** الخ سے نکاح کا جواز ثابت نہیں ہوتا، جیسا کہ آپ کا خیال ہے، تو عدم جواز کیسے ثابت ہوتا ہے؟ اور اس سے پہلے آپ لکھتے ہیں: یا عدت گزرنے پر اس کو رخصت کرے، اور یہ رخصت قطعی ہوگی، نکاح کے ساتھ بھی عورت مرد پر جائز نہیں (۱)۔یہ بجائے خود ایک دعویٰ ہے۔الفاظ خط کشیدہ کسی قرآنی آیت کا ترجمہ نہیں ہیں،

بقیہ صفحہ ۲۳ پر

(۱) پھر معلوم نہیں کہ قطعی رخصت ہوجانے سے مضمون نگار کی کیا مراد ہے۔اگر یہ مطلب ہے کہ کبھی اور کسی طرح نکاح ہی نہیں ہوسکتا، یعنی تحلیل کے بعد بھی نہیں تو مغلظ طلاق سے تو ایسی ابدی حرمت ہوتی ہی نہیں، رجعی سے کیسے ہوجائے گی، نیز اگر ایسا ہوتا، تو اس کا بیان نہایت ضروری تھا، اور اگر یہ مطلب ہے، کہ تحلیل کے بعد جائز ہے، تو دلیل چاہئے۔قرآن کا سیاق صاف بتاتا ہے کہ صرف تیسری ہی طلاق کے بعد تحلیل کی ضرورت ہے۔کما لا یخفی علی المتامل۔۱۲

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی عدالت وراستی کے دلائل کتاب وسنت سے

تحریر: دکتور محمد بن عبداللہ الوھیبی (دوسری قسط) ترجمہ: مولانا ازہر رشید الاعظمی

حدیث کے دلائل:

پہلی حدیث: **عن أبي سعيد رضي الله عنه قال: كان بين خالد بن الوليد وبين عبد الرحمن بن عوف شيءٌ، فسَبَّه خالدٌ، فقالَ رسولُ الله صلى الله عليه وسلم: "لا تَسُبُّوا أحَداً مِنْ أصحابي؛ فإنَّ أحدَكُمْ لو أَنْفَقَ مِثْلَ أُحُدٍ ذَهَباً مَا أدْرَكَ مُدَّ أَحَدِهِمْ وَلا نَصِيْفَه**[1].

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ خالد بن ولید اور عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان کچھ رنجش تھی، جس کی بنا پر حضرت خالد رضی اللہ عنہ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو کچھ نازیبا بات کہہ دی، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ کی اور فرمایا کہ: میرے کسی صحابی کو برا نہ کہو، اس لیے کہ اگر تم میں سے کوئی شخص اُحُد (پہاڑ) کے برابر بھی سونا خرچ کر دے تو ان میں سے کسی ایک کے مُد -ایک پیمانہ ہے- یا نصف مُد کے برابر صدقہ کی بھی برابری نہیں کر سکتا۔

ابن تیمیہ اس حدیث کی روشنی میں **الصارم المسلول** میں رقم طراز ہیں کہ یہی قول امام احمدؒ وغیرہ کا بھی ہے، کہ جو شخص نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ایک سال، یا ایک ماہ یا ایک دن بھی رہا، یا آپ کو ایمان کی حالت میں دیکھا تو وہ آپ کے صحابہ میں شامل ہے، جتنا عرصہ وہ آپ کے ساتھ رہا، اسی اعتبار سے اسے صحابیت کا حصہ نصیب ہوگا۔

یہاں اگر یہ اعتراض کیا جائے کہ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد رضی اللہ عنہ کو یہ کہہ کر کہ "اگر تم میں سے کوئی اُحُد پہاڑ کے برابر بھی سونا خرچ کرے تو ان میں سے کسی ایک کے مُد یا نصف مُد کی برابری

---

(۱) صحیح بخاری: كتاب فضائل أصحاب النبي صلى الله عليه وسلم، باب قول النبي: لو كنت متخذاً خليلاً، **حديث:۳۶۷۳**، وصحیح مسلم: كتاب فضائل الصحابة، باب تحريم سب الصحابة، **حديث:۲۵۴۱**، ط: عبد الباقي.

نہیں کرسکتا'' اپنے صحابہ کو برا کہنے سے کیوں منع کیا، جبکہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ بھی آپ ﷺ کے صحابۂ کرامؓ میں شامل تھے؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم رتبہ حضرات ان صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم میں سے ہیں، جنھوں نے اسلام لانے میں پہل کی، جنھوں نے آپ ﷺ کا ساتھ اُس وقت دیا جب کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ اور ان جیسے لوگ آپ سے دشمنی اور عداوت رکھتے تھے، اور جنھوں نے صلح حدیبیہ سے پہلے اپنا مال خرچ کیا اور آپ کے ساتھ کافروں سے جہاد وقتال کیا، اور ان لوگوں کا رتبہ ان لوگوں سے بڑھا ہوا ہے جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد خرچ کیا اور جہاد میں شریک ہوئے، یہ بات اور ہے کہ اللہ تعالی نے دونوں ہی فریقوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔ غرض کہ ان حضرات کو مقام صحابیت میں وہ امتیاز حاصل ہے، جو خالد رضی اللہ عنہ اور ان کے ہم رتبہ ان لوگوں کو حاصل نہیں جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد اسلام قبول کیا اور جہاد میں شریک ہوئے، اس لیے آپ ﷺ نے خالد رضی اللہ عنہ کو تاکید فرمائی کہ ان لوگوں کو برا بھلا نہ کہیں جنھوں نے ان سے پہلے آپ کا ساتھ دیا۔ اور بات درحقیقت یہ ہے کہ جو آپ کی صحبت سے محروم رہا اس کی نسبت اس شخص کے ساتھ جو آپ کی صحبت سے بہرہ مند ہوا ہے، اس نسبت کی طرح ہے جو خالد رضی اللہ عنہ کو سابقین صحابہ کے ساتھ حاصل ہے، بلکہ دونوں کی نسبتوں میں اس سے بھی زیادہ فرق اور دوری ہے(۱)۔

دوسری حدیث: **قال ﷺ لعمر: ''وَمَا يُدْرِيكَ، لَعَلَّ الله اطَّلَعَ عَلَى أَهْلِ بَدْرٍ، فقَالَ: اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ''** (۲)

آنحضرت ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ تمھیں کچھ پتہ بھی ہے؟ اللہ تعالی کو اہل بدر کے حالات پہلے ہی سے معلوم تھے پھر بھی اس نے یہ فرما دیا کہ تمھارا جو جی چاہے کرو، میں نے تمھاری مغفرت کر دی ہے۔

اس حدیث کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ''اعملوا'' میں عمل کا حکم تکریم اور عزت افزائی کے لیے ہے، اور مراد یہ ہے کہ اس سچے وعدے کی وجہ سے جنگ بدر میں شریک ہونے والوں سے ان کے کسی عمل پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

---

(۱) الصارم المسلول: ۵۷۶

(۲) صحیح بخاری مع فتح الباری: حدیث ۳۹۸۳، وصحیح مسلم: حدیث ۲۴۹۴

دوسرا مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان کے اعمال سیئہ وجود میں آتے ہی بخش دیے جاتے ہیں، گویا وہ ہوئے ہی نہ ہوں[۱]۔

امام نووی کہتے ہیں کہ علمائے کرام کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں کہ قیامت کے دن ان کی مغفرت اور بخشش ہوگی، اس لیے کہ اگر اہل بدر میں سے کوئی حد (یعنی شرعی سزا) وغیرہ کا مستحق قرار پائے تو دنیا میں اس پر حد شرعی جاری کی جائے گی، بلکہ قاضی عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے تو حد قائم کرنے پر علمائے امت کا اجماع نقل کیا ہے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تو ان میں سے ایک قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ پر حد جاری بھی کی ہے، اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت مسطح رضی اللہ عنہ پر حد جاری کی جو بدری صحابی تھے[۲]۔

اور ابن قیم کہتے ہیں: ''یوں تو اللہ ہی کو زیادہ علم ہے، مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ اس حدیث میں ان لوگوں کو مخاطب کیا گیا ہے جن کے متعلق اللہ تعالی یہ جانتے تھے کہ یہ لوگ اپنے دین کو خیر باد نہیں کہیں گے، بلکہ وہ اسلام پر مریں گے، اور اللہ تعالی کو یہ بھی معلوم تھا کہ ان سے بعض گناہ بھی سرزد ہوں گے جس طرح اوروں سے ہوتے ہیں، لیکن اللہ تعالی ان کو ان گناہوں پر اصرار کرنے اور جمنے نہیں دے گا، بلکہ انھیں خالص توبہ واستغفار اور نیکیوں کی توفیق عطا فرمائے گا، جس سے ان کے گناہ کا اثر زائل ہو جائے گا، اور یہ خصوصیت صرف انھی حضرات کو حاصل ہے، کیونکہ انھیں کے بارے میں یہ بات ثابت ہے کہ ان کا گناہ باقی نہ رہے گا اور یہ کہ ان کی مغفرت اور بخشش ہو چکی ہے۔ اس اعلان سے اس بات کی نفی نہیں ہوتی کہ مغفرت کا حصول ایسے اسباب سے ہوا جو ان ہی کے ساتھ قائم تھے، جس طرح یہ اعلان اس بات کا بھی متقاضی نہیں کہ وہ مغفرت پر بھروسہ کر کے فرائض کو چھوڑ دیں، اس لئے کہ اگر مغفرت کا حصول اللہ تعالی کے احکام کی پابندی کے بغیر ممکن ہوتا تو پھر ان حضرات کو نماز، روزہ، حج، زکاۃ اور جہاد کی ضرورت نہ ہوتی، اور یہ- یعنی فرائض کی ادائیگی کے بغیر مغفرت کا حصول- ناممکن ہے''[۳]۔

تیسری حدیث: عن عمران بن الحصین رضی اللہ عنہ قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم :

---

(۱) معرفة الخصال المكفرة لابن حجر العسقلاني: ۳۱، تحقيق: جاسم الدوسري، ط الأولى، ١٤٠٤هـ
(۲) صحیح مسلم مع شرح نووی: ۱۶/۵۶-۵۷۔
(۳) الفوائد لابن القيم: ص۱۹، المكتبة القيمة، ط: ١٤٠٤هـ.

''خَيرُ أُمَّتي قَرْنِي ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُوْنَهُمْ'' قال عمران: 'فلا أدري، أذكر بعد قرنه قرنين أو ثلاثاً' متفق عليه.(١)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میری بہترین امت میرے زمانے کے لوگ ہیں، پھر جو ان کے بعد آئیں گے، پھر وہ جو ان کے بعد آئیں گے۔ حضرت عمران- رضی اللہ عنہ - کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات یاد نہیں رہی کہ آپ نے اپنے زمانے کا ذکر کرنے کے بعد دو زمانوں کا ذکر کیا یا تین زمانوں کا۔

چوتھی حدیث: عن أبي موسى الأشعري رضي الله عنه، أنَّ رسولَ الله صلى الله عليه وسلم قال: ''النُّجُومُ أَمَنَةٌ للسَّماءِ، فإذا ذَهَبَتِ النُّجومُ أَتَى أَهْلَ السَّماءِ مَا يُوعَدُونَ، وَأنا أَمَنَةٌ لأَصْحَابي، فإذا ذَهَبْتُ أَتَى أَصْحَابِي مَا يُوْعَدُوْنَ، وأَصْحَابِي أَمَنَةٌ لأُمَّتِي، فإذَا ذَهَبَ أَصْحَابي أَتَى أُمَّتي مَا يُوْعَدُونَ.(٢)

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ستارے آسمانوں کی حفاظت کا ذریعہ ہیں، جب وہ بکھر جائیں گے تو آسمان والوں کو ان چیزوں کا سامنا ہوگا جن کی انھیں خبر دے دی گئی ہے (مطلب یہ ہے کہ جب تک ستارے باقی ہیں آسمان بھی باقی رہے گا، جب ستارے بے نور ہو جائیں گے تو آسمان بھی ٹوٹ پھوٹ جائے گا)۔ اور میں اپنے صحابہ کے لیے امن وامان ہوں، جب میں رخصت ہو جاؤں گا تو میرے صحابہ کو ان حالات کا سامنا ہوگا جن سے انھیں باخبر کر دیا گیا ہے (یعنی مختلف قسم کے فتنے سر اٹھائیں گے، جنگ وجدال کا بازار گرم ہوگا، فتنۂ ارتداد رونما ہوگا، لوگوں کے درمیان پھوٹ پیدا ہو جائے گی، اور وہ سب کچھ ہوگا جس کی پیشین گوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی تھی، اور وہ سارے واقعات پیشین گوئی کے مطابق ہوئے بھی)، اور میرے صحابہ رضی اللہ عنہم میری امت کے لیے امان کا ذریعہ ہیں، جب میرے صحابہ بھی رخصت ہو جائیں گے تو میری امت کو بھی ان واقعات کا سامنا کرنا پڑے گا جن کی انھیں خبر دی جا چکی ہے (یعنی طرح طرح کی بدعتوں کا ظہور ہوگا، دین میں نئی نئی باتیں ایجاد کی جائیں گی، وغیرہ وغیرہ)۔

---

(١) صحیح بخاری: حدیث ٣٦٥٠، ومسلم: حدیث ٢٥٣٥
(٢) صحیح مسلم: حدیث ٢٥٣١

پانچویں حدیث: عن عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، أن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم قال:
"أكرِمُوا أصْحَابي، فإنَّهُم خِيَارُكُم"(۱)
وفي رواية أخرى: "احفَظُوني في أصحابي"(۲)

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: میرے صحابہؓ کی عزت اوران کا اکرام کرو، یقیناً وہ تم میں بہترین لوگ ہیں۔ایک دوسری روایت میں آپ نے فرمایا کہ میرے صحابہ کے بارے میں میرا خیال رکھو۔

چھٹی حدیث: عن واثلة رضی اللہ عنہ یرفعه: "لا تَزَالُونَ بِخَيرٍ مَا دَامَ فِيكُمْ مَنْ رَأى مَنْ رَآني وصَحِبَني، والله لا تَزَالُونَ بخَيْرٍ مَا دَامَ فِيكُمْ مَنْ رَأى مَنْ رَآني وَصَاحَبَني"(۳)

حضرت واثلہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اس وقت تک برابر خیر وعافیت کے ساتھ رہو گے جب تک تمھارے درمیان وہ لوگ موجود ہوں گے جنھوں نے مجھے دیکھا اور میری صحبت اختیار کی۔ خدا کی قسم تم لوگ برابر خیر وعافیت کے ساتھ رہو گے جب تک تمھارے درمیان وہ لوگ موجود ہوں گے جنھوں نے مجھے دیکھنے اور میری صحبت اٹھانے والوں کو دیکھا -یعنی تابعین۔

ساتویں حدیث: عن أنس رضی اللہ عنہ، عن رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم: "آيةُ الإيمانِ حُبّ الأنصارِ، وآيةُ النِّفاقِ بُغْضُ الأنْصارِ" (۴)

نیز فرمایا ہے: "لا يُحِبُّهُم إلا مُؤمِنٌ، ولا يُبْغِضُهُمْ إلا مُنَافِق"(۵)

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انصار کی محبت ایمان کی علامت ہے،اورانصار سے بغض نفاق کی علامت ہے۔

---

(۱) اس کوامام احمد،نسائی اور حاکم نے صحیح سند سے روایت کیا ہے، دیکھئے مشکوۃ:۱۶۹۵/۳،اور مسند احمد ۱۱۲/۱ بتحقیق احمد محمد شاکر۔
(۲) اس کوابن ماجہ (۶۴/۲)،احمد (۱۸/۱) اور حاکم (۱۱۴/۱) نے روایت کیا ہے، حاکم نے اس کی تصحیح کی ہے اور ذہبی نے ان کی تصحیح کو باقی رکھا ہے۔ بوصیری نے زوائد ابن ماجہ میں لکھا ہے کہ اس کی سند کے تمام راوی ثقہ ہیں۔
(۳) مصنف ابن ابی شیبۃ: ۱۷۸/۱۲، السنۃ لابن ابی عاصم: ۶۳۰/۲، معجم کبیر: ۸۵/۲۲، معرفۃ الصحابۃ: ۱۳۳/۱، حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۵/۷) میں اس کو حسن کہا ہے، اور طبرانی نے مجمع الزوائد (۲۰/۱۰) مین لکھا ہے کہ طبرانی نے اس کو کئی واسطوں سے روایت کیا ہے، ان میں سے ایک سلسلۂ سند کے راوی صحیح بخاری کے راویوں میں سے ہیں۔
(۴) بخاری: ۱۱۳/۷، مسلم: ۸۵/۱ (۵) بخاری: ۱۱۳/۷، مسلم: ۸۵/۱ حدیث براء رضی اللہ عنہ

اور انصار کے بارے میں آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ: انصار سے محبت کرنے والا مومن ہی ہوگا، اور ان سے نفرت کرنے والا منافق ہی ہوگا۔

ان چند حدیثوں کے علاوہ اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں جن سے اجمالی طور پر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی فضیلت ظاہر ہوتی ہے۔ اور جہاں تک صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے تفصیلی فضائل کا تعلق ہے، تو اس سلسلے کی حدیثیں بے شمار ہیں، جن میں سے تقریباً دو ہزار احادیث وآثار کو امام احمدؒ نے اپنی کتاب **فضائل الصحابة** میں جو دو جلدوں پر مشتمل ہے، جمع کر دیا ہے، اور یہ اپنے موضوع کی جامع ترین کتاب ہے۔

اب تک کی بحث کا خلاصہ

پچھلے صفحات میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل ومناقب کے سلسلے میں جو حدیثیں اور آیتیں ذکر کی گئی ہیں، ان سے ہم مندرجہ ذیل نتائج اخذ کر سکتے ہیں:

۱:- اللہ تعالی نے صحابۂ کرام کی ظاہری وباطنی دونوں طرح کی پاکیزگی کو جگہ جگہ بیان کیا ہے۔ جہاں اللہ تعالی نے ان کی ظاہری پاکیزگی کا ذکر کیا ہے اور ان کی تعریف کی ہے، وہاں ان کے قابل تعریف عظیم الشان اور بلند اخلاق کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾[1] (صحابۂ کرام کافروں کے مقابلے میں تیز ہیں اور آپس میں مہربان ہیں) ﴿وَيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ﴾[2] (اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں، یہی لوگ تو صادق ہیں) ﴿وَلَا يَجِدُوْنَ فِیْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾[3] (اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی رشک اس سے جو کچھ کہ ان-مہاجرین-کو ملتا ہے، اور اپنے سے مقدم رکھتے ہیں ان کو اگرچہ خود فاقہ میں ہوں)۔

رہی بات ان کے باطنی اور اندرونی حالات کی تو اس میں کوئی شک نہیں کہ باطن کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں، صرف وہی دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ چنانچہ اس نے خود ہمیں صحابۂ کرام کی پاک باطنی اور نیک نیتی کی خبر دے دی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالی ارشاد فرماتے ہیں: ﴿فَعَلِمَ مَا فِیْ

(۱) سورة الفتح: ۲۹ (۲) سورة الحشر: ۸

(۳) سورة الحشر: ۹

قُلُوبِهِمْ فَأَنزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ﴾[1] (اوراللہ کومعلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا، سواللہ نے ان میں اطمینان پیدا کردیا) ﴿يُحِبُّونَ مَنْ هَاجَرَ إِلَيْهِمْ﴾[2] (محبت کرتے ہیں اس سے جو ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے) ﴿يَبْتَغُونَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا﴾[3] (اللہ کے فضل اور رضامندی کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں) ﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهٰجِرِيْنَ وَالْأَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ﴾[4] (بے شک اللہ نے نبی پر اور مہاجرین اور انصار پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی، جنھوں نے نبی کا ساتھ تنگی کے وقت میں دیا) غرض کہ اللہ تعالی نے جب ان کی نیتوں کی صداقت اور توبہ کی سچائی معلوم کر لی تو ان کی توبہ قبول فرمالی، اور یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ توبہ ایک خالص قلبی اور باطنی عمل ہے، جس کی سچائی کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہوسکتا۔

۲:- اللہ تعالی نے صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو ظاہری اور باطنی طور پر نیکی اور بھلائی کی جن اعلی خصلتوں کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائی تھی، اس کے سبب اس نے ہمیں یہ خبر دی ہے کہ وہ ان سے راضی ہو گیا، ان کی توبہ قبول کرلی، اور ان سے جنت کا وعدہ کرلیا ہے۔

۳:- صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی ان تمام خصوصیات کی بنا پر جن کا ذکر گزر چکا ہے، اللہ تعالی نے ہمیں ان کے لیے دعائے مغفرت کا حکم دیا ہے، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی عزت وتکریم کا، ان کے حقوق کی رعایت کا، اور ان سے محبت کرنے کا۔ ہمیں ان کو برا بھلا کہنے اور ان سے بغض رکھنے سے منع فرمایا ہے، بلکہ ان کی محبت کو ایمان کی علامت، اور نفرت وعداوت رکھنے کو نفاق کی علامت قرار دیا ہے۔

۴:- ان سب کے بعد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا خیر القرون اور اس امت کے لیے امن وامان ہونا فطری امر ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ان کی پیروی کرنا ضروری ہے، بلکہ جنت تک رسائی حاصل کرنے کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔ 'عليكم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدين المهديين من بعدي'[5] (تم لازم پکڑلو میری سنت کو، اور میرے بعد ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کی سنت کو)۔

---

(۱) سورة الفتح: ۱۸ (۲) سورة الحشر: ۹

(۳) سورة الفتح: ۲۹ (۴) سورة التوبة: ۱۱۷

(۵) اس کو احمد، دارمی اور اصحاب سنن اربعہ نے روایت کیا ہے، نیز دیکھئے جامع العلوم والحکم (ص ۳۸۷) اور ارواء الغلیل (۸/۱۰۷)۔

صحابیت کے مقام کے برابر کوئی مقام نہیں

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جو عظمت اور قدر و منزلت حاصل تھی اسے پہچاننا اور اس کی رعایت کرنا بڑے بڑے صحابۂ کرامؓ کے نزدیک بھی ایک مسلمہ حقیقت تھی، اور صحابیت کا یہ مقام بلند اس ادنی درجہ کے صحابی کو بھی حاصل تھا جسے آپ کی صحبت کا کم سے کم موقع ملا ہو۔

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی تعظیم اور قدر شناسی پر دلالت کرنے والے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حجر لکھتے ہیں: 'اس طرح کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جسے میں نے محمد بن قدامہ المروزی کی کتاب ''اخبار الخوارج'' میں پڑھا ہے۔ پھر آپ نے اس روایت کی سند ذکر کی ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں کہ نبیح العنزی نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ ہم ایک دن ابو سعید خدری کی مجلس میں تھے، آپ ٹیک لگائے ہوئے بیٹھے تھے، اتنے میں ہم نے حضرت علی و معاویہ رضی اللہ عنہما کا ذکر چھیڑ دیا۔ ایک شخص نے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی نامناسب بات کہہ دی، حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے یہ سنا تو اٹھ کر بیٹھ گئے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت میں پیش آنے والے ایک واقعہ کا ذکر کرنے لگے، جس میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور ایک دیہاتی صحابی موجود تھے، اس کے بعد فرمایا کہ پھر میں نے اس دیہاتی کو دیکھا کہ اسے انصار کی ہجو اور مذمت کرنے کے جرم میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عدالت میں لایا گیا ہے۔ انھیں دیکھ کر حاضرین مجلس سے حضرت عمر کہنے لگے کہ اگر اسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا شرف حاصل نہ ہوتا، جس کی وجہ سے نہ معلوم اسے کتنی بڑی سعادت حاصل ہو چکی ہے، تو میں اسے ایسی سزا دیتا جو تم سب کی طرف سے کافی ہو جاتی (۱)۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے تمام راوی ثقہ ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ جان لینے کے بعد کہ یہ بدو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے مل چکا ہے اور اسے صحابیت کا مقام حاصل ہے، اسے سزا دینا تو درکنار اس کی فہمائش و سرزنش بھی نہیں کی۔ اس واقعہ میں واضح شہادت پائی جاتی ہے اس بات کی کہ ان حضرات کے نزدیک صحابیت کی شان کے برابر کوئی شے نہیں تھی۔

---

(۱) اس کو امام احمد نے مسند (۳/۵۱) میں حضرت عمر کے کلام کے بغیر روایت کیا ہے، اور ان ہی الفاظ کے ساتھ علی بن الجعد نے (۲/۹۵۶) میں روایت کیا۔ ہیثمی نے اس کے راویوں کو ثقہ کہا ہے (۴/۹۲)۔ ابن حجر نے اس کو یعقوب بن شیبہ کے اور شیخ الاسلام ابن تیمیہ نے الصارم المسلول (۵۹۰) میں ابوذر ہروی کے حوالے سے نقل کیا ہے۔

وکیع نے بیان کیا کہ: میں نے حضرت سفیان کو اللہ تعالی کے اس قول: ﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى﴾ (۱) (آپ کہہ دیجئے کہ ہر تعریف اللہ ہی کے لیے ہے، اور اس کے ان بندوں پر سلام جنھیں اس نے منتخب کیا) کے بارے میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اس سے مراد محمد ﷺ کے صحابۂ کرام ہیں (۲)۔

غرض یہ کہ اللہ تعالی کی طرف سے صحابۂ کرام کا یہ انتخاب واختیار ایک ایسا معاملہ ہے جس کا نہ تو عقل کے ذریعہ تصور وادراک ہوسکتا ہے، نہ عقل کے پیمانہ سے اسے ناپا جاسکتا ہے۔ اور یہیں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ غیر صحابی کا عمل جس قدر بھی بلند ہو جائے، اس کے ساتھ صحابۂ کرام کے موازنہ کی کوئی گنجائش نہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: 'محمد ﷺ کے صحابۂ کرام کو برا بھلا نہ کہو، اس لیے کہ کسی صحابی نے اگر آپ ﷺ کی ایک گھڑی صحبت اٹھائی ہے تو وہ تمھارے چالیس سال کے عمل سے بہتر ہے'۔ اور وکیع کی روایت کے الفاظ یہ ہیں: 'تمھاری اپنی عمر بھر کی عبادت سے بھی بہتر ہے' (۳)۔

چنانچہ جمہور علماء کرام کی رائے ہے کہ صحابیت کی فضیلت کے برابر کوئی عمل نہیں ہوسکتا، اس لیے کہ صحابی کو آنحضرت ﷺ کا دیدار نصیب ہوا ہے، اور جن صحابہ - رضی اللہ عنہم - کو آپ ﷺ کے دفاع کا موقع ملا، اور جن کو ہجرت کے ذریعہ، یا آپ کی نصرت ومدد کے ذریعہ، یا آپ سے حاصل ہونے والی شریعت کے محفوظ کرنے اور اسے اپنے بعد والوں تک تبلیغ کے ذریعہ دوسروں پر جو سبقت حاصل ہوئی، ان کے برابر بعد کے آنے والوں میں سے کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ ہر وہ نیکی جس پر کوئی شخص سب سے پہلے عمل کرے تو اسے ان لوگوں کے عمل کے برابر بھی اجر وثواب ملے گا جو اس کو بعد میں انجام دیں گے، لہذا صحابۂ کرام کی فضیلت دوسروں پر اس سے بھی نمایاں ہو جاتی ہے (۴)۔

امام احمد اپنے عقیدہ کے بیان کے ضمن میں فرماتے ہیں: 'ان میں کم درجے کا صحابی بھی ان

---

(۱) سورة النمل: ۵۹

(۲) اصابہ: ۱/۲۰-۲۲، ط: دار الکتاب العربی، بحاشیۃ استیعاب۔ اس اثر کو طبرانی نے معجم کبیر (۳/۲۰) میں روایت کیا ہے، نیز دیکھئے تفسیر ابن کثیر ۳/۶۹

(۳) فضائل الصحابہ لاحمد: ۱/۵۷، ابن ماجہ: ۱/۳۱ (الأعظمی) السنۃ لابن ابی عاصم: ۲/۴۸۴

(۴) فتح الباری: ۷/۷

لوگوں سے افضل ہے جنھوں نے آپ کو دیکھا نہیں ہے، اگر چہ وہ اللہ تعالی سے تمام-اچھے-اعمال کے ساتھ ملیں'(۱)۔

اور امام نووی نے لکھا ہے: 'صحابیت کی فضیلت -خواہ لمحہ بھر کی ہو- کے برابر نہ کوئی عمل ہے، نہ صحابیت کا مرتبہ کسی چیز کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ فضیلتیں قیاس سے نہیں حاصل کی جاتی ہیں، بلکہ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ جسے چاہتا ہے عطا کر دیتا ہے'(۲)۔

نیز اللہ تعالی کی طرف سے- جو دلوں کے رازوں سے باخبر ہے- صحابۂ کرام کے جس باطنی اور اندرونی تزکیہ اور پاکیزگی کا ذکر مختلف آیتوں میں کیا گیا ہے، جیسے فرمان الٰہی: ﴿فَعَلِمَ مَا فِيُ قُلُوُبِهِمُ﴾ (اور اللہ کو معلوم تھا جو کچھ ان کے دلوں میں تھا) اور ان کی توبہ کی قبولیت کے اعلان میں: ﴿لَقَدُ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالُمُهٰجِرِيُنَ وَالْاَنُصَارِ﴾ (بے شک اللہ نے نبی ﷺ پر اور مہاجرین اور انصار پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائی) اور ان سے اپنی رضا کے اظہار میں: ﴿لَقَدُ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الُمُؤُمِنِيُنَ اِذُ يُبَايِعُوُنَكَ تَحُتَ الشَّجَرَةِ﴾ (بے شک اللہ خوش ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ وہ آپ ﷺ سے بیعت کر رہے تھے درخت کے نیچے) یہ ساری فضیلتیں صحابۂ کرام ﷺ کے ساتھ مخصوص ہیں، تو کیا ان کے بعد والوں کو بھی ایسی خصوصیات اور ایسی پاکیزگی باطن کی سند حاصل ہے؟

لیکن یہاں کوئی کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے(۳) کہ: بعض روایتوں سے آپ کی ذکر کردہ باتوں کے برعکس دوسری بات معلوم ہوتی ہے، جیسے حضرت ابوثعلبہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں رسول اکرم ﷺ کے یہ الفاظ کہ: **"تأتي أيام للعامل فيهن أجر خمسين" قيل: منهم أو منا يا رسول الله؟ قال: بل منكم**(۴).

یعنی ایسے ایام بھی آنے والے ہیں، جن میں عمل کرنے والوں کو پچاس آدمیوں کا اجر و ثواب ملے گا۔ عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ یہ پچاس آدمی ان میں سے ہوں گے یا ہم میں سے؟ تو آپ نے فرمایا کہ ان میں سے نہیں بلکہ تم میں سے ہوں گے۔

---

(۱) شرح اصول اعتقاد اھل السنۃ: ۱/۱۶۰

(۲) مسلم مع شرح نووی: ۱۶/۹۳

(۳) اس رائے کے قائلین میں سب سے زیادہ شہرت امام ابن عبدالبر رحمۃ اللہ علیہ کی ہے، اور مذکورہ استدلال ان کے قوی تر استدلالات میں سے ہے، لیکن جمہور علماء کی رائے اس کے خلاف ہے، جس کی جانب ہم اشارہ کر چکے ہیں۔

(۴) ابوداود: ۴۳۴۱، ترمذی: ۲/۱۷۷، ابن ماجہ: ۴۰۱۴، ابن حبان ۳۸۵: ۱۸۵۰

اسی طرح حضرت ابو جمعہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ کیا ہم سے بھی بہتر کوئی ہے؟ ہم نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، آپ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوئے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: "**قوم يكونون من بعدكم يؤمنون بي ولم يروني**" (۱) ایسے لوگ جو تمھارے بعد آئیں گے اور مجھ پر ایمان لائیں گے حالانکہ انھوں نے مجھے دیکھا نہ ہوگا۔

اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے علماء نے دونوں قسم کی حدیثوں میں تطبیق کے متعدد وجوہ ذکر کیے ہیں، ذیل میں ہم ان میں سے اہم وجوہ کا ذکر کرتے ہیں:

۱:- **للعامل فيهن أجر خمسين** والی حدیث سے افضلیت معلوم نہیں ہوتی، کیونکہ کسی عمل پر صرف اجر کی زیادتی سے عمل کرنے والے کی علی الاطلاق افضلیت ثابت نہیں ہوتی۔

۲:- مفضول (جس پر دوسروں کو فضیلت حاصل ہے) میں ایسے فضائل اور خصوصیات ہوسکتی ہیں جو فاضل (جو دوسروں پر فضیلت رکھتا ہے) میں نہ ہوں، لیکن اس کے باوصف مجموعی خصوصیات کے اعتبار سے وہ فاضل کے برابر نہیں ہوسکتا۔

۳:- یہ بات یوں بھی کہی جاسکتی ہے کہ صحابی اور غیر صحابی کے درمیان افضلیت کا اعتبار انھیں چیزوں میں ہوسکتا ہے جو ان دونوں میں جمع ہوسکتی ہیں، جیسے تمام مسلمانوں کے درمیان مشترک عمومی نیکیاں ہیں، اس لیے ان چیزوں میں اگر کوئی غیر صحابی کسی صحابی سے افضل ہو جائے تو یہ بات بعید از امکان نہیں ہے۔ لیکن آپ ﷺ کی ذات اقدس کے دیدار اور آپ کے روئے انور کی تجلیات سے مشرف وفیض یاب ہو کر صحابۂ کرام کو جو ایک امتیازی شان حاصل تھی، وہ ایک ایسی ماوراء عقل چیز ہے جس کے قریب بڑے سے بڑے نیک اعمال کے ذریعہ بھی پہنچنا کسی کے بس کی بات نہیں، چہ جائیکہ اس کی برابری کی جاسکے (۲)۔

۴:- حضرت ابو جمعہ رضی اللہ عنہ کی حدیث کے الفاظ پر تمام راویوں کا اتفاق نہیں ہے، چنانچہ بعض راویوں نے لفظ 'خیر' کے ساتھ اس حدیث کی روایت کی ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، جبکہ بعض نے ان الفاظ کے ساتھ اس حدیث کی روایت کی ہے: '**قلنا يا رسول الله هل من قوم أعظم منا**

---

(۱) احمد: ۴/۱۰۶، دارمی، طبرانی: ۴/۲۲-۲۳، اس کو حاکم اور ذہبی نے صحیح کہا ہے، اور حافظ ابن حجر نے فتح الباری (۷/۶) میں اس کی سند کو حسن کہا ہے۔ دیکھئے الفتح الربانی: ۱/۱۰۳-۱۰۴

(۲) صواعق محرقہ: ۳۲۱

أجراً؟' (ہم نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ کیا کوئی قوم ہم سے بھی زیادہ اجروثواب والی ہے؟)

حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ فتح الباری میں فرماتے ہیں کہ: اس روایت کی سند پہلی روایت کی سند سے قوی تر ہے، اور ابوثعلبہ کی حدیث کے مطابق بھی ہے، اور حدیث ابوثعلبہ کا جواب گزر چکا ہے، واللہ اعلم۔

آخر میں اس بات کی وضاحت اور تنبیہ ضروری ہے کہ جمہور اہل علم اور بعض علماء کے درمیان جو اختلاف پایا جاتا ہے، وہ بڑے اور مشاہیر صحابۂ کرام جیسے خلفاء اربعہ اور بقیہ عشرۂ مبشرہ، اور ان صحابۂ کرام کو شامل نہیں ہے جن کے بارے میں خصوصی فضائل وارد ہوئے ہیں، جیسے بیعت عقبہ، غزوۂ بدر اور غزوۂ تبوک وغیرہ میں شریک ہونے والے صحابۂ کرام ہیں؛ بلکہ اختلاف صرف ان صحابہؓ کے بارے میں ہے جنھیں آپ ﷺ کا صرف دیدار نصیب ہوا ہے، اسی لیے امام ابن عبدالبر نے اختلاف کے باوجود جنگ بدر اور صلح حدیبیہ کے شرکاء کا استثناء کیا ہے[1]۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۵۸ کا بقیہ

اس کتب خانے کی قلمی کتابیں موضوع کی رعایت سے بڑے بڑے کمروں میں تقسیم تھیں، ہر کمرے میں خاص موضوع سے متعلق کتابیں تھیں، جس انداز میں مصر کے فاطمی خلیفہ حاکم بامراللہ کے کتب خانے میں تھیں، اس کا ثبوت ابن الفرات کی اس روایت سے ہوتا ہے کہ دارالعلم کا ایک کمرہ صرف قرآن کریم کے نسخوں پر مشتمل تھا۔

دارالعلم صرف کتب خانہ نہیں تھا، بلکہ اس سے زیادہ وسیع اور ہمہ گیر تھا، اگرچہ کتب خانہ اس کے زیادہ بڑے اور اہم حصے پر مشتمل تھا، اور درحقیقت جو امر قابل توجہ ہے وہ یہ کہ عہد اسلامی کے عوامی کتب خانے صحیح معنی میں عوامی تھے۔

---

(۱) فتح الباری: ۷/۷

اعیان الحجاج سے ماخوذ

مشاہیر کرام کے واقعات حج

از: محدث جلیل ابوالمآثر حضرت مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ

مولوی زین اللہ بستوی آپ موضع دریاباد پرگنہ مگہر ضلع بستی کے باشندہ، اور ریاست چھتر پور (بندیل کھنڈ) میں مدرس تھے، آپ نے ۱۲۹۰ھ میں برفاقت خواجہ احمد حسین خاں معتمد خاص والی رام پور حج کیا اور خود توشۂ حجاج کے نام سے اس سفر کی روئداد لکھی، یہ رسالہ ۱۲۹۲ھ میں طبع ہوا ہے۔

اس میں لکھتے ہیں کہ مدرسہ چھتر پور میں ان کو بیس روپیہ ماہوار ملتے تھے، ۲۴/رمضان ۱۲۹۰ھ کو روانہ ہوئے ۲۷[1] ماہ مذکور کو بمبئی پہنچے، دخانی جہاز (آگبوٹ) کے آنے اور ملنے میں دیر تھی اس لیے چندروز بمبئی میں ٹھہرنا پڑا، ۱۲/شوال کو آگبوٹ جان فریڈ عرف کوئنا میں ۴۵ روپیہ کرایہ دے کر سوار ہوئے اس جہاز میں ایک ہزار سے زیادہ مسافروں کو لینے کا حکم نہیں تھا۔

انگریزی جہاز تھا جس میں ۱۵/سو آدمی سوار ہوتے تھے اور وہ نو دن میں جدہ (جس کا فاصلہ بمبئی سے تیس ہزار میل ہے[2]) پہنچتا تھا۔

جو کرایہ ہم نے دیا وہ تتق کا تھا، تتق کے دو درجے ہوتے ہیں ایک وہ جو سب سے نیچے ہوتا ہے اس میں فقط مال رہتا ہے، اس میں آدمی سوار ہوں تو شاید نصف سے زیادہ مرے ہوئے ملیں دوسرا درجہ مال والے کے اوپر ہوتا ہے اسی میں ہم سوار ہوئے اور بہت تکلیف اٹھائی، گرمی بدبو، پسوؤں اور جوؤں کی کثرت سے وہ اذیت برداشت کرنا پڑی کہ معاذ اللہ۔

جہاز کا ایک درجہ دبوسا (کذا) کہلاتا ہے نہایت آراستہ وپیراستہ کمرہ کی طرح ہوتا ہے اس کا کرایہ نوسو روپئے ہے، پانچ چھ آدمی شریک ہوکر لیتے ہیں۔

دبوسا کے دونوں جانب آراستہ کوٹھریاں بھی ہوتی ہیں، ایک کوٹھری تین سو روپئے کو ملتی ہے

(۱) اصل میں ۷/ماہ مذکور چھپا ہے۔ (۲) رسالہ میں یونہی مذکور ہے

اس میں تین آدمی شریک ہوکر بیٹھتے ہیں پھراس سے گھٹ کراوپر کی چھتری ہےاس پر بھی بڑاآرام ہے، اس کا کرایہ ساٹھ ستر روپئے تک ہے۔

۳؍شوال ۱۲۹۰ھ کو جہاز بندرعدن پرلنگر انداز ہوا، ہم یہاں دو دن مقیم رہے اور شہر دیکھا ۲۴؍شوال کولنگر اٹھااور جہاز کی جانب روانہ ہوا دوسرے دن یلملم پہاڑ ملااس موقع پراحرام باندھا جاتا ہے ۲۸؍شوال کو۳ بجے دن میں جہاز جدہ کی بندرگاہ میں لنگرانداز ہوااور شیدیوں نے اپنی کشتیوں میں حاجیوں کوان کے سامان سمیت سوار کرکے دریا کے کنارے پہنچادیا اور فی کس آٹھ آٹھ آنے لیے۔مطوفین کے آدمی حاجیوں کو لینے کے لیے جدہ آجاتے ہیں، جدہ سے مکہ تک اونٹ کا کرایہ اگر شقدف (کذا) کیجئے تو ۳؍ریال اوراگرشبری کیجئے تو دو ریال ہے۔

ہم ۲۷ (یہاں کچھ غلطی ہے) شوال کوسواری شتر جدہ سے روانہ ہوئے اور ۲۹؍شوال کو مکہ معظّمہ پہنچے۔سیدابوبکرمطوف کے یہاں ٹھہرے، ۷؍ذی الحجہ کوامام خطبہ پڑھ رہا تھا کہ عین اسی وقت شامی قافلہ آیااوراس نے گواہی دی کہ آج آٹھویں ذی الحجہ ہے چونکہ ایک دن کا فرق پڑ گیااس لیے جلدی جلدی تیاری کرنے میں حاجیوں کو بہت تکلیف ہوئی تمام لوگ گھبرا کرکوئی رات کوکوئی علی الصباح اندھیرے سے اونٹوں اور خچروں کا کرایہ کرکے جانبِ عرفات روانہ ہونا شروع ہوئے [(۱)]، محتاج لوگ پاپیادہ جاتے ہیں، مکہ سے عرفات کا واپسی کرایہ فی اونٹ دو ریال اور فی خچر نصف ریال بدرجہ اوسط مقرر ہے،اس سال ایرانی شیخوں کی کثرت کی وجہ سے اونٹ کا کرایہ اور ہر چیز بہت گراں تھی۔اس سال بہ نسبت ہرسال سابق کے زیادہ حجاج جمع ہوئے، یقین ہے کہ دس بارہ لاکھ آدمی سے بھی سوا ہوں گے۔میدان بازار عرفات اور مزدلفہ کا نہایت گلزار اور ہر شئ موجود اور منیٰ میں بازار نہایت عمدہ پختہ سنگین بنا ہوا ہے۔۱۲؍ذی حجہ روز جمعہ کو ہم منیٰ سے رخصت ہوکرحرم شریف پہنچے اور طواف وزیارت سے مشرف ہوئے۔۲۳؍ذی الحجہ ۱۲۹۰ھ دوشنبہ کو بعد ظہر مکہ سے ہمارا قافلہ جانب طیبہ روانہ ہوا، شقدف کی سواری سے اونٹ کا کرایہ بدرجہ اوسط فی کس دونوں طرف کا ۲۴ ریال، اور شبری سے ۲۳ ریال مقرر ہے، اس سال کثرت حجاج وزوار کی وجہ سے پچیس تک پہنچ گیا، جس کے سوا چھپن روپئے چہرہ شاہی ہوتے، شتربان نصف کرایہ روانگی سے پہلے وصول کرلیتے ہیں، راستہ میں کھانا

(۱)افسوس ہے کہ منیٰ نہ پہنچ سکے

اور پانی بھی ان کو دینا پڑتا ہے ورنہ بہت ستاتے ہیں۔

مکہ سے چل کر شام کو ہم وادیٔ فاطمہ پہنچے، نہر زبیدہ کا پانی نہایت شیریں اور شفاف ہے، نکالیے تو گرم، اور تھوڑی دیر رکھ دیجئے تو برف کی طرح سرد ہو جاتا، اس منزل میں امن و امان رہا، امید ہے دوسری منزلوں میں بھی امن رہے گا، اول قافلہ سالار بدواں نہایت عقیل اور صاحب علم ہے دوسری بیگم صاحبہ جوناگڈھ بڑی ہوشیار اور جہاں دیدہ ہیں، اس لیے کہ بیگم صاحبہ کا ساتواں حج ہے۔ علاوہ بریں ان کے سپاہی تمام شب پہرہ دیتے رہتے ہیں، اور خود بھی پہرہ لیتی ہیں، رات میں نہیں سوتیں، صبح کو دن چڑھے تک سوتی ہیں۔ ۲۲ر ذی الحجہ کو قافلہ وادیٔ فاطمہ سے روانہ ہو کر دس بجے رات کو مقام اسفند (عسفان) میں پہنچا۔ اس جگہ بھی پانی کثرت سے اور شیریں ملا اور ہر طرح امن رہا۔ ۲۵ر ذی الحجہ کو بعد ظہر قافلہ چلا اور چار بجے فجر کو مقام خلیصہ (خلیص) میں پہنچا، اس مقام میں ایک مسکین بڈھے کی گھڑی چور لے گئے اور باقی ہر طرح خیریت رہی۔ ۲۶ر ذی الحجہ کو بعد ظہر قافلہ یہاں سے چل کر رات کے تین بجے بیر کظیمہ (بیر قصیمہ) پر پہنچا ایک حاجی قضاء الٰہی سے مر گیا، یہاں چوروں کا شور و غل تو رہا مگر کسی کا مال نہیں گیا پھر ۲۷ر ذی الحجہ کو یہاں سے دوپہر کو کوچ کیا اور پانچ بجے بیر مستور (مستورہ) پر پہنچے یہاں ایک رامپوری حاجی قضاء حاجت کو گیا اس کے پاس کچھ اشرفیاں تھیں چوروں نے اس کو بہت زخمی کیا اور اشرفیاں چھین لیں، وہ حاجی دوسرے قافلہ میں تھا، اس رات کو نہایت شور وغل اور واویلا رہا۔ یہ سفر مدینہ طیبہ کا نہایت خوفناک ہے، ۲۸ر ذی الحجہ کو بیر مستور (مستورہ) سے ایک بجے دن میں روانہ ہوئے اور آدھی رات کے قریب مقام رابق (رابغ) میں پہنچے، یہاں پر ہر طرح خیریت رہی پانی کو بھی چنداں تکلیف نہیں ہوئی پھر بھی کثرت حجاج کی وجہ سے ہر کنویں میں پانی چک گیا اور کیچڑ نکلنے لگی، حالانکہ موسم سرما تھا۔ اس لیے گرمی میں ضرور پیاس سے لوگ مرتے ہوں گے، چنانچہ اسی میدان میں دو قبریں باپ اور بیٹے کی بنی ہوئی ہیں جو پیاس سے مر گئے تھے، یہاں قلعہ مختصر سنگین سلطان روم کا ہے۔ ۳۰ر ذی الحجہ کو رابغ سے چل کر شب کے دو بجے مقام بیر ملتف (ملف) پر پہنچے۔ یہاں پانی کی نہایت قلت اور تکلیف رہی مغربی قافلہ میں پانی کے واسطے کنویں پر تلوار چلی مگر زخم کاری سے محفوظ رہے، چوروں سے امان رہا۔

یکم محرم ۱۲۹۱ھ کو ملتف سے کوچ ہوا، اور رات کے دو بجے بیر عباس پر قافلہ پہنچا بدوؤں کے

سردار کا مکان بیر عباس سے ۴رکوس کے فاصلہ پر ہے اس لیے وہ راستہ ہی سے کٹ کیا اور ساتھ کے بدوؤں نے بیگم صاحبہ کا تھیلا برتن اور دیگر اشیاء آٹا دال نمک کا کاٹ لیا جب صبح کو سردار آیا اور بیگم صاحبہ نے شکایت کی تو وہ تلاش کے لیے گیا، تھوڑے فاصلہ پر خالی تھیلا پڑا پایا پھر واپس آ کر بیگم صاحب سے دست بستہ اپنا اور بدوؤں کا قصور معاف کرایا سب کو معلوم ہو گیا کہ یہ حرکت ساتھ والے بدوؤں کی تھی۔

۲رمحرم ۹۱ھ کو بیر عباسؔ سے بعد ظہر قافلہ روانہ ہوا اور شب کے آٹھ بجے مقام وادی شہدآء میں پہنچا، یہاں ہر طرح امن رہا اس لیے کہ یہ مقام مدینہ منورہ سے بہت قریب ہے پانی وغیرہ کا بھی بہت آرام رہا۔

۳رمحرم ۹۱ھ کو دس بجے دن میں یہاں سے قافلہ نے کوچ کیا اور شب کو تین بجے مدینہ منورؔہ میں ہم داخل ہوئے اور متصل مسجد نبوی قدیم کے بیگم صاحبہ تقریباً نصف قافلہ کے ساتھ فروکش ہوئیں، سب لوگوں نے اسی مسجد میں نماز فجر ادا کی، مگر اس عاصی نے چندرا مپوری حجاج کے ساتھ حرم شریف جا کر با جماعت نماز فجر پڑھی اور نماز کے بعد صلوٰۃ وسلام پڑھنے کی سعادت حاصل کی۔

تمام ملک عرب میں روپۓ کے عوض ریال چلتا ہے اور ریال ہندوستان کے روپۓ کے حساب سے سوا دو روپۓ کا ہوتا ہے اور اشرفی کی جگہ دینار اور آنہ کے بجائے قرص (قرش) اور قرش سوا آنے کا ہوتا ہے۔

۴رصفر ۱۲۹۱ھ دوشنبہ کے دن بارہ دن قیام کرنے کے بعد تیرہویں روز مکہ معظّمہ سے ہم نے بعد نماز عصر کوچ کیا، اور شب میں حدہ (بالحاء) رہ کر دوسرے روز شب میں بارہ بجے جدہ میں داخل ہوئے۔ تمام شب جاگ کر صبح کی، شوئی قسمت سے اسی دن آگبوٹ چھوٹ گیا پندرہ بیس دن دوسرے آگبوٹ کے انتظار میں پڑے رہے اور انواع انواع کی تکلیف حجاج کو ہوئی، پانی بہت گراں قیمت سے ملتا تھا۔ پسوؤں کی کثرت تھی، چوبیس روز تک آگبوٹ کا انتظار کرنا پڑا تا آنکہ ۲۹رصفر کو سویز سے ایک آگبوٹ مسمی جان لارس یکا یک آنکلا، حجاج بہت خوش ہوئے مگر جب نول (کرایہ) کپتان نے جاری کیا تو معلوم ہوا کہ اسی روپیہ فی نفر مانگتا ہے، چونکہ حجاج کے پیسے چک گئے تھے اس لیے سناٹا چھا گیا، پھر کپتان نے کچھ سوچ کر ساٹھ روپۓ لینے کا حکم دے کر وصول کرنا شروع کر دیا مجبوراً ہم نے

بھی اس آگبوٹ کا کرایہ کرلیا، اس سال ہندوستانی حاجی بہت کثرت سے آئے، اتنا زیادہ کرایہ کبھی اور سال میں نہ ہوا کمال گراں ہوتو تیس بتیس روپیہ۔

اس جہاز میں جن کے پاس خاطر خواہ روپیہ تھا وہی سوار ہو سکے، میرے پاس بھی پچاس ہی روپئے رہ گئے تھے، لیکن باعانت خواجہ صاحب مسبوق الذکر کے سوار ہوا۔ ابھی جدہ میں بہت لوگ مجبور پڑے ہیں جو بغلوں میں، یا جب بادی جہاز دستیاب ہوگا قریب موسم بارش کے سوار ہوں گے ابھی موسم بادی جہازوں کا نہیں ہے۔ بادی جہاز اگر موافق ہوا نہ ہوتو دو چار مہینے تک ٹکراتا پھرتا ہے، آگبوٹ کی ٹیم (ٹائم) مقرر ہے کسی وجہ سے دیر ہوئی تو دو ایک روز کا فرق پڑتا ہے۔

حاجی لوگ یکم ربیع الاول ۱۲۹۱ھ کو جہاز میں سوار ہوئے اور دو ربیع الاول کو دس بجے دن میں لنگر اٹھایا گیا، اور ۷/ربیع الاول کو چھ بجے شام کے وقت عدن میں داخل ہوا، آٹھ گھنٹے تاخیر سے اس لیے پہنچا کہ جدہ سے باب سکندری (باب المندب) تک دریا میں بڑا تلاطم تھا، آگبوٹ زیروزبر ہوتا رہا، ایک شبانہ روز عدن میں قیام کے بعد ۸/تاریخ کو چھ بجے شام آگبوٹ بمبئی روانہ ہوا اور ۱۸/ربیع الاول کو رات کے بارہ بجے بندر بمبئی میں داخل ہوا، ۱۹/کی صبح کو حاجی لوگ جہاز سے اترے۔

ہم تین دن بمبئی میں ٹھہر کر ۲۱ کو ریل میں سوار ہوئے۔ اور ۲۴ کو فتح پور پہنچے، یہاں خواجہ صاحب کا ساتھ چھوٹ گیا وہ رامپور تشریف لے گئے اور میں ۲۵ کو بسواری شکرم شہر باندہ کی طرف روانہ ہوا، ۲۶/کو داخل شہر ہوا، پندرہ دن وہاں قیام کرنے کے بعد ۱۲/ربیع الثانی کو باندہ سے روانہ ہو کر بمقام سرائے کبریٰ مقام کیا۔ اور ۱۳ کو مہوبے میں اور ۱۴ کو ملہرا قیام کیا، وہاں سے فجر کے بعد روانہ ہو کر بارہ بجے دن میں چھتر پور پہنچا۔

مولانا نصر اللہ خاں خورجوی | ۱۲۲۶ھ میں پیدا ہوئے، تکمیل فنون سپہ گری کے بعد عمر کے اٹھارہویں سال میں ان کے ماموں فتح علی تحصیل دار اعظم گڈھ نے ان کو تعلیم دینے کے لیے مولوی چراغ علی کے سپرد کیا۔

۱۲۴۶ھ میں اپنے استاذ مولانا احمد علی چریا کوٹی کے ہمراہ بنارس گئے اور تین سال وہاں رہ کر تمام علوم درسیہ (باستثناء حدیث) کی تحصیل سے فراغت پائی، اس کے بعد درس دینا شروع کیا، اپنے استاذ کی تصنیفات کی شرح اور بعض پر حواشی لکھے۔

شاہ عبدالعلیم صاحب کو بنارس میں پایا اور ۱۲۴۷ھ میں شاہ صاحب نے ان کو سلسلۂ قادریہ میں داخل فرمایا ۱۲۵۲ھ میں خلافت حاصل ہوئی، بکثرت لوگوں نے آپ سے فیض ظاہر و باطن حاصل کیا۔

سرکار انگریزی میں متعدد عہدوں پر رہے، ۱۲۴۹ھ میں نائب تحصیل دار مقرر ہوئے اور اعظم گڈھ میں خود اپنے ماموں کی نیابت کی ۱۲۵۱ھ میں تحصیل سلیم پور کے منصرم، بعد میں تحصیل دار مقرر ہوئے پھر تین ماہ کی چھٹی لے کر ماموں کے پاس رہے اس کے بعد ترقی کی فکر میں الہ آباد آئے اور ضلع مین پوری میں ڈپٹی کلکٹر مقرر کیے گئے۔ پھر تبدیل ہو کر بجنور آئے وہاں سے مظفر نگر ٹرانسفر ہوا بعد چندے انگریزی نوکری ترک کر کے خانہ نشین ہو گئے، پھر ریاست کپورتھلہ کی طرف سے بہرائچ کا کام کیا، آخر میں غیر مسلموں کی نوکری سے گویا توبہ کر لی اور ۱۲۸۱ھ ہجری میں حیدرآباد کا رُخ کیا، ایک کتاب تاریخ حیدرآباد کے نام سے لکھی اس میں منزل بمنزل راہ کے حالات اور حیدرآباد کی آبادی و تعمیر وغیرہ کا مفصل حال لکھا ہے۔

حیدرآباد میں نواب مختار الملک سرسالار جنگ بہادر کی ملازمت میں پندرہ سال رہے اس کے بعد پنشن ہو گئی جو آخر عمر تک قائم رہی۔ اس کے علاوہ ریاست حیدرآباد سے دوسو روپئے ماہوار وظیفہ بھی ملتا تھا۔

اس سفر کی کچھ تفصیل ان کے خلیفہ مولوی فرید احمد غازی پوری نے بیاض جانفزا میں بیان کی ہے، لکھتے ہیں شوال ۱۲۹۲ھ میں حیدرآباد سے باارادۂ حج بمبئی آئے اور چالیس دن یہاں قیام کرنے کے بعد ۱۷ ذی قعدہ ۱۲۹۲ھ کو دخانی جہاز سے جدہ روانہ ہوئے، ایک بندر میں ایک روز لنگر ہوا، جب مقابل عدن پہنچے تو ایک روز وہاں بھی ٹھہرے، بعض لوگوں نے شاہ عیدروس کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھی، جدہ پہنچے تو چھوٹی چھوٹی کشتیاں دخانی کے قریب آئیں کشتی والے اپنے طور پر مسافروں کا سامان اتار کر رکھنا شروع کر دیتے ہیں، اور کنارہ سے پہلے کشتی روک کر من مانی اجرت وصول کر لیتے ہیں اس لیے اجرت پہلے سے طے کر لینی چاہئے۔ مطوفین مکہ کی طرف سے اکثر لوگ ہندی کی جدہ آتے ہیں اور حاجی سے مطوف کا نام پوچھ کر اس مطوف کے وکیل کے سپرد اس حاجی کو کر دیتے ہیں جدہ کے شہر پناہ کے پھاٹک پر ترکی لوگ تلاشی اسباب مسافران کی منجانب سلطان روم کرتے ہیں اور

اپنے قاعدہ سے محصول لیتے ہیں اور روانگی محصول کی رسید لینے کے لیے پھاٹک میں جانا پڑتا ہے اس وقت بہت چوکسی کی ضرورت ہوتی ہے، ہم نے پہلے حج میں سید ابوبکر رشیدی کو مطوف کیا تھا اس سفر میں بھی انھیں کو منتخب کیا، ان کا نائب عبدالحلیم ہندی بہت لائق اور خلیق ہے، جدہ سے شقذف اور شبری پر مکہ جاتے ہیں اسباب کی حفاظت اسی میں زیادہ ہے، ورنہ خچر بھی بہت جاتے ہیں اور بعد مغرب جدہ سے چل کر صبح کو نماز فجر حرم میں پڑھوادیتے ہیں، شتر میں دو دن لگ جاتے ہیں جدہ میں شب باشی کا آرام ملتا ہے، راہ میں جابجا قہوہ خانے ہیں۔

مکہ معظّمہ میں مولانا شاہ محمد عمر نقشبندی دہلوی مہاجر کے مکان میں باب العتیق کے قریب قیام کیا، شاہ محمد عمر صاحب حرم میں ایک خاص جگہ ہر نماز پنجگانہ کے بعد حلقہ کر کے تعلیم وتوجہ دیا کرتے تھے اس وقت چند صاحب اجازت مرید بھی حاضر تھے، صاحبزادہ شاہ ابوالخیر صاحب ان میں سب سے ممتاز تھے، مولانا نصر اللہ خاں بھی شریک حلقہ ہوتے تھے اور مولوی فرید کو بھی توجہ دلاتے تھے۔

ایک مقام میں صاحب طریقہ صابریہ حاجی امداد اللہ صاحب مستانہ وار عالم رضا وتسلیم میں مشغول بحق رہتے تھے اور طریقہ جاری رکھتے تھے۔

مکہ معظّمہ پہنچ کر دو روز میں سامان کی حفاظت کا انتظام کیا اور منی وعرفات جانے کی تیاری کی اس پانچ دن کے سفر کے لیے فی شتر پانچ ریال کرایہ طے ہوا، ۷/ ذی الحجہ کو بعد اشراق حج کا احرام باندھ کر منیٰ روانہ ہوئے جو بفاصلہ تین کروہ یا کم وبیش ہے، ۸/ ذی الحجہ کو وہاں سے بحکم قاضی عرفات روانہ ہوئے کیونکہ حج اکبر تھا یعنی نویں ذی الحجہ کو جمعہ تھا، پس بنظر احتیاط بسبب شبہہ اختلاف ہلال ذی الحجہ کے دو روز عرفات میں حاضر رہے، قبل دوپہر کے مسجد نمرہ میں تمام حاجی حاضر ہوئے اور زوال ہوتے ہیں ظہر کی اذان ہوئی اور نماز ظہر پڑھی گئی پھر خطبہ ہوا اس کے بعد تکبیر کہہ کر نماز عصر ادا کی گئی ہنوز ظہر کا وقت باقی تھا[۱]۔

پھر سب حاجی اپنے اپنے مقام وبستر پر آئے اور قاضی صاحب جبل رحمت کے اوپر بسواری ناقہ چڑھ گئے اور سواری پر حج کا خطبہ شروع کیا یعنی آخر وقت سے غروب آفتاب تک اس وقت تمام

---

(۱) اس وقت کیا ہوتا ہے اور کیا کرنا چاہئے اس کو مناسک حج کے معتمد رسالوں میں پڑھئے، اسی طرح تمام مسائل میں سفر ناموں کے بجائے مناسک کی کتابوں پر اعتماد کیجئے۔

حاجی زیر دامان کوہ خطبہ سننے کو حاضر ہوتے ہیں، مولانا نصر اللہ مع مولانا شاہ محمد عمر اور دیگر بزرگان کے اپنے مقام میں زیر دامان کوہ میدان میں مراقب ہوئے وقت مغرب بغیر ادائے نماز کسی قدر دال روٹی کھا کر عرفات سے روانہ ہوئے اور نو بجے رات کو مزدلفہ میں مسجد خیف (یہ غلط ہے مشعر حرام لکھنا چاہئے) پہنچے اور فوراً مغرب بنیت ادا پھر فرض عشاء پڑھی پھر سنت مغرب بعدہ سنت عشاء اور وتر پڑھی۔ دسویں کو مزدلفہ سے روانہ ہوئے چار گھنٹے میں منیٰ پہنچے اور درمیان پہاڑوں کے متصل مسجد (خیف) کے اترے فوراً رمی جمرۂ عقبہ کیا، مقام فرودگاہ سے مسجد دوسو قدم پر تھی، اور مسجد سے جمرہ عقبہ کا فاصلہ پانچ سوستر قدم ہے۔ ملا سید داغستانی کی معرفت پانچ گوسفند دس ریال میں خرید کر قران کی قربانی کی[1] اس مقام پر روٹی جس کو اکثر عیش کہتے ہیں سوا دو قرش کو ملتی ہے اور اجرت بنانے گوشت قربانی کی سوا قرش، اور اجرت حلاق ۳ر قرش، اور پانی ایک مشک تین قرش کو ملتا ہے، اور قرش غالباً سوا آنہ ہندوستانی کا ہوتا ہے۔

بعد رمی اور قربانی کے حلق کرا کے احرام اتارا اور ہندی کپڑے پہنے، اسی دن شام کو ابر نمودار ہوا اور کسی قدر بارش باراں سے سردی ظاہر ہوئی۔ گیارہویں کو مولانا نصر اللہ ہم سب کو رمی جمار کے لیے ساتھ لے گئے اور مولانا محمد عمر کے ساتھ کھڑے ہو کر دعا فرمائی، بارہویں ذی الحجہ کو حجاج حاضر حرم کعبۃ اللہ میں ہوئے اور طواف زیارت کر کے شکر بجق بجالائے۔

بارہ دن حرم کی حاضری کے بعد ۲۳ ذی الحجہ کو باب العتیق پر مولانا محمد عمر نے مقابل خانہ کعبہ دعائے سلامتی کر کے رخصت کیا اور قافلہ مدینہ طیبہ روانہ ہوا کرایہ شتر شقدف کا فی شتر ۱۴ ریال اور ایک ایک ریال خوراک شتر کا ایک طرف کا قرار پایا۔ سید زکریا داغستانی مرید شاہ احمد سعید، اور سید غلام مصطفیٰ مرید مولانا مظہر ساتھ تھے، رابق (رابغ) میں احمد مختار پاشا (حاکم رابغ نے) قلعہ سلطانی میں دعوت کا اہتمام کیا اور ایک شامیانہ اور چار ترکی سپاہی پہرہ کے لیے دیے، مولانا عبدالحی لکھنوی واسطے ملاقات کے اندرون شامیانہ تشریف لائے۔ کیفیت طے مسافت راہ مدینہ طیبہ بطور فہرست مختصر یہ ہے، ۲۳ر ذی الحجہ روز جمعہ بعد نماز براہ مزار محمود شاہ بن سلطان ابراہیم اور جبل ابوجہل سے نکل کر مناخہ تک پہنچے، نماز عصر کے بعد مناخہ سے روانہ ہوئے دس بجے رات کو وادی فاطمہ میں داخل ہوئے

(۱) جب ساتویں کو مکہ میں احرام باندھا اور اس سے پہلے عمرہ کر کے احرام کھول چکے تھے تو قران کیسے ہوا؟

اور نماز مغرب کی مسجد تنعیم میں پڑھی تھی، ۲۴ رکو نو بجے دن میں وادی فاطمہ سے چل کر نصف شب مقام بیر تفلا(۱) میں پہنچے، ۲۵ کو نو بجے دن میں چلے اور مقام خلیص میں پہنچے، ۲۶ کو خلیص سے روانہ ہو کر بیر قضیمہ (بیر قدیم لکھا ہے) پہنچے یہاں گوشت اور کھجور ملتی ہے۔ ۲۷ کو سات بجے قضیمہ سے چلے اور آٹھ بجے رات کو رابق (رابغ) پہنچے، ایک روز قیام کیا ۲۹ کو سات بجے دن میں قافلہ روانہ ہوا اور سات بجے رات کو مقام بیر مستورہ میں پہنچا، اس منزل میں کنویں کا پانی بہت شیریں ہے اور آبادی اس سے متصل ہے، اسی جگہ ہلال محرم ۱۲۹۳ھ نظر آیا، یکم محرم بروز جمعہ یہاں سے روانگی ہوئی سردی سخت اور ہوا تیز تھی، اور راہ گم ہو جانے کی وجہ سے رات بھر اونٹ چلتے رہے بلکہ گر گر پڑتے تھے آخر الامر بمقام بیر حسانی ۲ رمحرم کو نماز فجر نصیب ہوئی، یہاں آب شیریں کی کثرت ہے، گوشت، خرما، بادام، کھجور نیز لکڑی بہت ہے، یہاں سے کچھ قافلہ جدا ہو کر براہ ملف کہ تین روز کی راہ مدینہ طیبہ کی ہے روانہ ہوا، ہم لوگ راہ سلطانی میں رہے، ۲ رمحرم کو اسی دن دو پہر کو بیر حسانی سے کوچ ہوا اور ایک پہر رات گزری تھی کہ وادی صفراء میں پہنچے اس جگہ باغ بہت ہیں اقسام کھجور اور بقولات پائے جاتے ہیں، یہاں سے ۴ کروہ پر وادی حمراء ہے اس کو واسطہ بھی کہتے ہیں اس جگہ بڑا بازار ہے۔

۳ رمحرم کو وادی صفراء میں قیام رہا یہاں سے ینبع بفاصلہ راہ یک روزہ کے ہے اس منزل کی راہ میں جا بجا مواضع اور مزارع خصوص جدیدہ مثل شہر کے ہے، ۴ رمحرم کو بوقت اشراق وادی صفراء سے قافلہ چلا اور آٹھ بجے رات کو بیر عباس پہنچا، رات بھر رہ کر ۵ رمحرم کو عین شدت ہوائے سرد میں چل کر ۸ ربجے رات کو مقام فریش میں پہنچے یہاں پانی بہت کم ملتا ہے۔ ۶ رمحرم کو کوچ ہوا دس بجے رات کو شہر مدینہ پہنچے اور باب صغیر پر شب باش ہوئے۔ ۷ رمحرم کو بعد نماز صبح مولانا محمد مظہر مجددی کے رباط میں قیام ہوا۔

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب اور حضرت مولانا عبدالغنی صاحب محدث مع مریدان ومجازان اکثر خود رباط میں تشریف لاتے تھے اور دیر تک صحبت رہتی تھی، حکیم عبدالسلام ملیح آبادی اور مولانا عبدالحی لکھنوی اور دیگر عمائد علماء وحکماء کا مجمع بھی رہا کرتا تھا۔

مدینہ میں حضرت مولانا شاہ مظہر صاحب کا حلقہ جاری تھا، مولانا نصر اللہ کا حکم تھا کہ ان

---

(۱) بیر عسفان مراد ہوگا۔

حضرات کی صحبت وحلقہ کوغنیمت جانو اور بقدرامکان وفرصت یہ نعمت لے لومولوی فرید چند بار حلقہ میں حاضر ہوئے ایک دن کچھ نقدی دے کرفرمایا کہ اس کو بحضور مولانا عبدالغنی صاحب لے جا کر اپنے لیے دعا کراؤ اور اگر درس حدیث کا جاری پاؤ شریک ہو جاؤ، تبرکاً سبق لے لو، حرم میں تلاش کیا تو وہ جگہ خالی پائی جہاں تشریف رکھتے تھے باہر نکل کر پوچھا تو معلوم ہوا کہ یہی بزرگ تھے جو تمہارے ساتھ سے ہو کر چلے جاتے ہیں، سبحان اللہ ایسی سادہ وضع اور خالص طور میں تھے کہ بہ نسبت شہرت کمالات اور عظمت ان کی شناخت میں غلطی ہوگئی اور ندامت ہوئی، بہر حال مولانا موصوف کو اپنے پیر کا پیغام پہنچایا اور جو کچھ تھا پیش کیا، مولانا موصوف اس عاجز کو اپنے مکان پر لے گئے اور دعائیں دے کر ممتاز کیا، اس زمانہ میں کثرت زائرین کی وجہ سے درس حدیث عارضی طور پر بند تھا۔

۳۰ رمحرم ۱۲۹۳ھ کو بعد اشراق صلوٰۃ وسلام کی سعادت حاصل کی، پھر باب مصری سے مناخہ آئے یہاں تخت رواں (ہندوستانی پالکی کی طرح مگر آگے اور پیچھے دونوں طرف پہیہ مثل بگھی کے ہوتا ہے اور دونوں طرف سے ایک ایک اونٹ اس کو لے چلتا ہے) تیار تھا مولانا نصر اللہ تخت پر اور ساتھی شتر پر مکہ معظّمہ روانہ ہوئے، مدینہ سے مکہ تک تخت رواں کا کرایہ اسی ریال، اور مقام رابق (رابغ) سے اگر چھوڑ دیا جائے تو دوثلث تقرر ہوا۔ اور شتر کا کرایہ فی شتر ۱۳ ریال علاوہ کرایہ شبری، مکہ معظّمہ تک اور ۹ ریال رابق (رابغ) تک۔

واپسی میں پہلی منزل وادی عر متعلق قریش تھی، دوسری منزل غرّہ صفر کو مقام خلص تیسری بیر حسانی، چوتھی بیر شیخ، پانچویں بیر مستورہ، ۵ رصفر کو بیر مستورہ سے نو بجے دن کو چلے اور آٹھ بجے رات کو مقام رابق (رابغ) متصل قلعہ پہنچے ۶ رصفر کو ایک دن قیام ہوا، رابق کے پاشا سے ملاقات کی یہاں تخت رواں کو آپ نے چھوڑ دیا اور رابق سے احرام باندھ کر سمندر کے کنارہ پر پہنچے اور بغلہ میں سوار ہوئے، بغلہ کا کرایہ فی کس ۲۰ قرش مقام سایہ دار کا، اور فی کس ایک روپیہ بے سایہ کا مقرر ہوا، اور ساحل سے بغلہ تک کشتی کا کرایہ تین قرش پڑا، رابغ میں بیخ مرجان نہایت ارزاں تھی۔ چونکہ ہوا مخالف تھی اس لیے رابق سے بغلہ آہستہ آہستہ دو روز میں جدہ پہنچا، بغلہ کی روانگی سے پہلے ایک ترکی حکیم نے جانچ کے بعد اجازت سفر دی اور قرنطینہ والوں نے ایک ایک روپیہ وصول کیا درمیان میں بوقت شب لنگر ہوا۔ جدہ سے صفدر خاں کو بکرایہ دس روپیہ بمبئی روانہ کر دیا گیا اور ہم لوگ مولانا کی

معیت میں ۱۴؍صفر کو داخل مکہ معظّمہ ہوئے اور ۱۳؍صفر کو عمرہ کیا۔

مولانا رحمت اللہ صاحب (کیرانوی) ملنے آئے اور امتحان طلبہ میں شرکت کے لیے کہا مولانا نصر اللہ نے مولوی فرید کو بھیج دیا، وہاں مولوی رضا علی صاحب بنارسی سے ملاقات ہوئی وہ بھی شریک مجلس تھے۔ مولانا نصر اللہ نے ایک دن مولوی فرید کو معظم مکرم صاحب طریقہ صابریہ مستجمع فضائل حمیدہ حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر کی خدمت میں بھیجا اور فرمایا کہ ان سے حزب یمانی سیف الرحمٰن کی اجازت لے لو اور نقل دعا کی بھی مانگ لو، چنانچہ حاجی صاحب نے اجازت دی اور بہت دعا دی (ص ۱۲۹) ۱۶؍صفر کو طواف وداع کر کے اور مولانا محمد عمر صاحب سے رخصت ہوکر جدہ روانہ ہوئے، اور ۱۹؍صفر کو دخانی نیمساوی میں دس بجے دن کو سوار ہوئے ۲۰؍صفر کو بروز جمعہ یہ جہاز بمبئی روانہ ہوا اور ۳ ماہ ربیع الاول ہم داخل بمبئی ہوئے۔

مولانا نصر اللہ خاں صاحب نے ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی۔

مولانا محمد طاہر (ساکن پورہ معروف) نے ۱۲۶۰ھ میں حج کیا۔

۱۲۹۶ھ میں وفات پائی، دیکھو (میرا مضمون ''دو متبرک اجازت نامے'' رسالہ معارف میں) مولوی صاحب علی ساکن گھوسی (والد مولوی عبد القادر) نے ۱۲۷۶ھ میں حج کیا تھا۔

۱۲۸۱ھ میں وفات پائی۔

مولانا عبد اللہ مئوی المتوفی ۱۳۲۱ھ) نے ۱۲۸۶ھ میں حج کیا، حالات کی کچھ تفصیل میرے مضمون ''دو متبرک اجازت نامے'' میں ملے گی۔

مولوی عبد القادر ساکن گھوسی نے ۱۳۲۱ھ میں حج کیا اس سفر میں ان کی ملاقات میرے استاذ مولانا عبد الغفار صاحب سے ہوئی تھی، جیسا کہ میرے استاذ بیان فرماتے تھے، مولوی عبد القادر صاحب نے ۱۲۹۸ھ میں بھی ایک حج کیا تھا، ان کے کتب خانہ میں ایک کاغذ دستیاب ہوا تھا جس میں منازل راہ مکہ تا مدینہ درج تھیں، اس پر ۱۲۹۸ھ درج تھا۔

(جاری ہے)

اسلامی کتب خانے

(گیارہویں قسط)

از: دکتور علی بن علی ابو یوسف جہنی　　　　ترجمہ و تلخیص: مسعود احمد الاعظمی

۳-کرخ -بغداد- میں واقع سابور کا دار العلم:

یہ وہ دار العلم ہے، جس کو وزیر ابونصر بن سابور متوفی ۴۱۶ھ نے بغداد میں کرخ کے کنارے ۳۸۲ھ=۹۹۱ء میں عہد بویہ میں قائم کیا تھا، سابور ہی کے نام پر اس کتب خانے کا نام رکھا گیا، اس کا دوسرا نام ''دار العلم'' تھا، ابن تغری بردی نے لکھا ہے: ''۳۸۲ھ میں وزیر ابونصر سابور بن اردشیر نے کرخ میں ایک دار العلم قائم کیا، اس کو اہل علم پر وقف کر دیا، اور اس میں بڑی تعداد میں کتابیں فراہم کیں''۔ (۱)

ابن الاثیر نے بہت باریکی کے ساتھ اس دار العلم کا محل وقوع بیان کیا ہے، اور اس کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دونوں فصیلوں کے درمیان ایک محلے میں واقع تھا۔

سابور بہاء الدولہ کا وزیر تھا، وسعت علم وادب سے بہرہ مند تھا، شروع شروع میں میر منشی تھا، اہل علم سے محبت رکھتا تھا، ابن کثیر نے اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے: ''تین بار بہاء الدولہ کا وزیر رہا ہے، شرف الدولہ کا بھی وزیر تھا، بہت اچھا منشی تھا، مال ودولت کا حریص نہیں تھا، بہت خیرات کرنے والا اور صاف دل تھا، اذان کی آواز سنتے ہی نماز کے لیے تیار ہو جاتا تھا''۔ (۲)

اس کتب خانے کی شاندار عمارت اور اس کی خوبصورتی کی متعدد مصنفین نے تعریف کی ہے، اس کے اخراجات کے لیے ابونصر نے بہت ساری قیمتی املاک وقف کر دی تھیں، جو اس وقت تک کفایت کرتی رہیں جب تک کتب خانہ زندہ رہا، اور اس طویل مدت میں کسی کا محتاج نہیں ہوا، اس نے

(۱) النجوم الزاہرہ: ۱۶۴/۴　　(۲) البدایہ والنہایہ: ۳۱۲/۱۱

اپنی خریدی اور جمع کی ہوئی کتابوں کا بہت بڑا ذخیرہ اس میں منتقل کیا، اس کی ایک فہرست تیار کی، اس کی کتابوں کی تعداد اس قدر تھی، کہ ابن الجوزی اور ابن الاثیر نے لکھا ہے کہ اس میں دس ہزار سے زیادہ مجلد کتابیں تھیں، منجملہ ان کے قرآن کریم کے سو نسخے تھے، جن کی کتابت خاندان بنی مقلہ کے مشہور خطاطوں نے کی تھی۔ (۱)

ایک دوسری روایت کے مطابق اس میں دس ہزار چار سو مجلد کتابیں تھیں، جو کسی ایک موضوع پر خاص نہیں تھیں، بلکہ متعدد دینی و دنیوی علوم وفنون پر مشتمل تھیں، کتب خانے میں ایک بڑی تعداد ایسی کتابوں کی تھی، جو مشہور افراد کی ملکیت میں رہ چکی تھیں، اس کی بیشتر کتابیں خود ان کے مصنفین کے قلم سے تھیں، کتب خانے کا انتظام اور دیکھ بھال ابوالحسن محمد بن ابی شیبہ اور ابوعبداللہ محمد بن احمد الحسینی کے سپرد تھا، جن کا تعاون ابوعبداللہ حسین بن ہارون ضبی نام کے ایک قاضی کیا کرتے تھے، نیز اس کا مزید اہتمام شیخ ابوبکر محمد بن موسیٰ خوارزمی حنفی - متوفی ۴۰۳ھ=۱۰۱۲ء - کے سپرد کیا تھا۔ (۲)

اس کتب خانے کو زبردست ترقی حاصل ہوئی، اور اس کا طائر شہرت دور دراز تک پہنچا، یہ درس ومطالعہ اور بحث وتحقیق کا ایک اہم مقام اور فکری روشنی کا مرکز تھا، جہاں علماء، ادباء، شعراء، اور محققین ہر طرف سے سفر کر کے آتے تھے، اور اس میں ہبہ اور عطیہ کے طور پر اپنی تصانیف وتالیفات کا اصل نسخہ رکھنے میں فخر محسوس کرتے تھے۔

اس کی تصریح یاقوت حموی نے احمد بن علی بن خیران کاتب - متوفی ۴۳۱ھ=۱۰۳۹ء - کے تذکرے میں کی ہے، اور لکھا ہے کہ انھوں نے - یعنی احمد کاتب نے - مصر میں بغداد کے سفیر ابومنصور ابن الشیر ازی کو اپنے اشعار ورسائل کے دو جز دیے، وہ اس کو لے کر بغداد گئے، تاکہ ابوالقاسم شریف مرتضی کے سامنے پیش کریں، جو اس وقت دارالعلم کے نگراں تھے، اور شریف کے علاوہ دوسرے سربرآوردہ لوگوں کو دکھا کر دارالعلم میں ان کے رکھنے کے لیے مشورہ کریں، تاکہ اس عظیم الشان کتب خانے کی دسیوں ہزار کتابوں کے درمیان ان کو رکھا جا سکے، اس کتب خانے کا قاعدہ یہ تھا کہ ایسے اہل علم کے ذریعے جو اپنی دقت نظر اور وسعت علم میں مشہور تھے، ان تحائف کا جائزہ لیے بغیر ان کو قبول نہیں کیا جاتا تھا۔

---

(۱) طبقات الاطباء: ۱/۱۴۶ (۲) المنتظم: ۷/۱۷۲

مشہور شاعر ابوالعلاء معری ان مشہور ترین لوگوں میں تھا، جنھوں نے دارالعلم کی زیارت، اس کے ذخیروں کی معرفت اور اہل علم وادب سے تعارف کے واسطے بغداد کے لیے رخت سفر باندھا تھا، ابوالعلاء ایک سال سے زیادہ مدت تک بغداد میں مقیم رہ کر دارالعلم سے فیض یاب ہوتا رہا، کتب خانے کے خازن ابومنصور اور عبدالسلام بصری سے اس کی گہری دوستی ہوگئی، اور اس نے اپنا انیسواں رسالہ ابومنصور کی خدمت میں پیش کیا۔ (۱)

اس دارالعلم سے بہت سے لوگ وابستہ تھے، یہ لوگ بسا اوقات کتب خانے کی ایک کمیٹی کی شکل اختیار کر لیتے تھے، جس میں خازن، اس کا معاون، خادم اور کچھ نسخہ نویس ہوتے تھے، ان سب سے اس کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس طرح یہ ایک نہایت معیاری کتب خانہ تھا، جس نے اس دور کے عالم اسلام کے مشاہیر کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا تھا، اس سے سالہا سال تک علماء وطلبہ استفادہ کرتے رہے، اس میں نشستیں اور حلقے منعقد ہوتے، محاضرات ہوتے، اور غالباً یہی وجہ ہے کہ بعض مورخین نے اس کے لیے ''مدرسہ'' کا لفظ بھی استعمال کیا ہے۔

یہ دارالعلم تقریباً ستر سال تک آباد رہا، مگر اپنے بانی کی وفات کے بعد زیادہ مدت تک زندہ نہ رہ سکا، ۴۵۱ھ = ۱۰۵۹ء تک لوگ اس سے استفادہ کرتے رہے، اس کے بعد ''کرخ'' میں ایک زبردست آگ لگی، اور یہ کتب خانہ بھی اسی کی نذر ہوگیا، کچھ کتابیں سلطان طغرل بک سلجوقی کی فوجوں کے ذریعے لوٹ لی گئیں، یہ وہی فوج تھی جس نے کرخ میں آگ لگائی تھی، کچھ اور کتابیں تباہ ہونے سے بچالی گئیں، اور سلطان طغرل بک کے وزیر عبدالملک کندری کے کتب خانے میں شامل کردی گئیں۔

طرابلس شام کا دارالعلم:

یہ کتب خانہ پانچویں صدی ہجری کے اختتام (گیارہویں صدی عیسوی کے آغاز) میں عرب اسلامک کلچر کا سب سے مشہور کتب خانہ سمجھا جاتا تھا، طرابلس شام میں اس کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔ اس کو ''کتب خانۂ بنی عمار'' بھی کہا جاتا تھا، یہ خاندان آل عمار کی طرف منسوب تھا، جس نے پانچویں صدی ہجری میں شامی ساحل کے ایک حصے پر حکمرانی کی، اور صلیبی جنگوں تک اس کی حکمرانی

---

(۱) رسالۃ الغفران، تحقیق: بنت الشاطی: ۲۷۹

برقراررہی،ان لوگوں نے طرابلس شام کو اپنا دارالحکومت بنایا،طرابلس تیسری صدی ہجری اوراس کے بعد ملک شام کے اہم ترین تجارتی بندرگاہوں میں تھا۔

آل عمار کے عہد میں زراعت،تجارت اورصنعت وحرفت کو بہت فروغ حاصل ہوا،اور اقتصادی زندگی غیرمعمولی طور پررواں ودواں رہی،طرابلس کے بندرگاہ کی وسعت اورتجارتی سرگرمی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے،کہ اس کی گودی میں ایک ہزار کشتیوں کی گنجائش تھی،اسی وجہ سے یعقوبی -متوفی ۲۸۴ھ=۸۹۷ء- نے اس کو بہت سراہا ہے،اوراپنی کتاب ''البلدان'' میں اس کی نسبت لکھا ہے کہ وہ ''ایک عجیب وغریب بندرگاہ ہے،جوایک ہزار کشتیوں کو اٹھالیتی ہے''۔

اسی طرح زراعتی دولت بھی ایک اہم محرک تھی،جوطرابلس کی سوشل ترقی میں اثر انداز تھی، اس دورمیں یہ ملک صحیح معنی میں دولت مند تھا،کہا جاتا ہے کہ اس میں چار ہزار ماہر کاریگر تھے،جو پشمینہ، ریشم اورکتان کے کپڑے تیار کرتے تھے،مزید براں ایک کارخانہ کاغذسازی کا بھی تھا،جس کا کتابوں کی اشاعت اورتمدن کے فروغ میں اہم حصہ تھا۔

اس طرح تجارت وزراعت اورصنعت وحرفت کے یہ اقتصادی عوامل شہر کی ترقی اورخوشحالی میں کارفرمارہے،اور یہ سب فطری طور پرعلمی اورتہذیبی ترقی پرعکس انداز ہوئے۔

چنانچہ طرابلس الشام کے شہر کو چوتھی وپانچویں صدی ہجری (دسویں وگیارہویں صدی عیسوی) میں ایسی علمی سرگرمی اورثقافتی ترقی حاصل ہوئی،جواس کی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نظرنہیں آتی،اس ترقی کے نتیجے میں آگے چل کراس کے سرپر''دارالعلم'' کا تاج رکھا گیا،جس میں ایک عظیم الشان کتب خانہ تھا،جومسلمانوں کی تہذیبی تاریخ کا گوہرآبدار تھا۔

اس دارالعلم کے قیام کی تاریخ میں مؤرخین کا اختلاف ہے،اکثر محققین کا خیال یہ ہے کہ اس کا مؤسس ابوطالب حسن بن عمار-متوفی ۴۶۴ھ-تھا،یہ اس شہر کا سب سے پہلا خودمختار فرماں روا تھا،اس نے ۴۷۲ھ=۱۰۸۴ء کے اوائل میں اس کو قائم کیا،اس کی طرف ایک مؤرخ نے اپنے سلسلۂ کلام میں یوں اشارہ کیا ہے: ''ابن عمار نہایت زیرک اورصائب الرائے تھا،طرابلس میں اس کا ایک دارالعلم تھا،جس میں ایک لاکھ سے زیادہ کتابیں وقف تھیں''۔ (۱)

(۱) المنتظم:۸/۲۵۶

بعد میں جلال الملک ابوالحسن علی بن محمد بن عمار طرابلس کے حاکم اور قاضی -متوفی ۴۹۲ھ = ۱۰۹۸ء- نے اس کی تجدید اور توسیع کی، یہ ۴۷۲ھ = ۱۰۸۰ء کا واقعہ ہے، اس نے اس میں بہت سی کتابوں کا اضافہ کیا، دوسری طرف آل عمار کی وقف کردہ کتابوں کا ایک کلیکشن اس کو عطیہ کیا گیا، جس میں چھ کتابیں ابوالعلاء معری کی تصنیف کردہ تھیں۔ (۱)

کتابوں کے ذخیرے کے اعتبار سے طرابلس کا یہ کتب خانہ مسلمانوں کے مالدار ترین کتب خانوں میں سے تھا، اور ابن ابی طی -متوفی ۶۳۰ھ- کا خیال ہے کہ وہ اس دور کے کتب خانوں میں خوبصورت ترین اور کتابوں سے سب سے زیادہ معمور تھا، کتابوں کی کثرت اور قدر و قیمت کے لحاظ سے اس کتب خانے کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں تھی، انھوں نے اپنے والد کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہوتا تھا۔ (۲)

طرابلس کے بنی عمار حکمرانوں نے اس کتب خانے پر اپنی پوری توجہ صرف کی، اور اس کے لیے گشت کرنے والے نمائندے مقرر کیے، جو نادر کتابوں اور مخطوطوں کی تلاش میں عالم اسلام کے مختلف خطوں کی خاک چھانتے رہتے۔ اس کتب خانے میں ۸۰ سے زیادہ نسخہ نویس تھے، جن میں تیس ایسے تھے، جو شب و روز کتب خانے ہی میں مقیم رہا کرتے تھے، یہ لوگ باری باری خدمت انجام دیا کرتے تھے، ان کو سالانہ تنخواہیں دی جاتی تھیں، اس کتب خانے کی بیشتر کتابیں خوبصورت جلدوں سے مجلد تھیں، سونے اور چاندی سے آراستہ و مزین تھیں، اور اس وقت کے مشہور ترین خطاطوں کے خط سے لکھی ہوئی تھیں۔

اس میں ایک بڑی تعداد ایسی تصانیف کی بھی تھی، جو اپنے مصنفین کے قلم سے تھیں۔ طب، فلکیات، ادب، تاریخ اور علم و فن کی ہر نوع پر مشتمل تھیں۔

پانچویں صدی ہجری کے اس دار العلم میں کتابوں کی تعداد کتنی تھی، اس کے متعلق روایتیں مختلف ہیں، ایک قول کے مطابق اس میں کتابوں کی تین لاکھ جلدیں تھیں، یہ اس وقت کی بات ہے جب اس کا آفتاب نصف النہار پر تھا، پچاس ہزار صرف قرآن کریم کے نسخے تھے، اسی ہزار (۸۰۰۰۰)

---

(۱) الوقف وبنية الكتب العربية: ۴۸

(۲) ابن القلانسی رتاریخ دمشق: ۱۶۴، وابن الاثیر ا/ ۳۳۵

تفسیر کی کتابیں تھیں، اس تعداد کی طرف بہت سے عرب اور مستشرق مؤرخین نے بھی اشارہ کیا ہے، جس کو یہ مؤرخین ابن الفرات سے نقل کرتے ہیں۔ ابن الفرات کا قول ہے کہ:

''طرابلس کے دار العلم کی دنیا میں کوئی نظیر نہیں تھی، جس میں تیس لاکھ کتابیں تھیں''۔(۱)

اس کی تائید شوشتری کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے، وہ اپی کتاب ''**مختصر الثقافة الإسلامية**'' میں لکھتا ہے کہ ''طرابلس کے کتب خانے میں اتنی بڑی تعداد میں کتابیں تھیں، کہ اس وقت تک کسی کتب خانے میں اتنی زیادہ کتابوں کے ہونے کا علم نہیں تھا''۔(۲) یعنی فرانس کے مشہور کتب خانے بوڈلین میں چند سال پہلے کتابوں کی جو تعداد تھی، اس کا تقریباً تین چوتھائی تھیں، یا اس وقت انڈو پاک کے کتب خانوں میں کل ملا کر جتنی کتابیں ہیں اس کے نصف سے زیادہ تھیں۔(۳)

بنی عمار کے عہد میں طرابلس نے کافی ترقی کی تھی، دولت علم سے مالا مال ایک ترقی یافتہ شہر بن چکا تھا، جہاں دوسرے شہروں کے اہل علم آتے، اور اپنی علمی خدمات پیش کرتے۔(۴)

مگر اس کتب خانے نے بہت مختصر زندگی پائی، اور مؤرخین نے قیام کے صرف تیس سال کے بعد اس کے ضائع ہو جانے پر سخت رنج ظاہر کیا ہے، عرب اسلامی تمدن کا یہ مشہور عوامی کتب خانہ بارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں سواحل شام کی صلیبی جنگوں کے دوران غارت گری اور آتش زنی کا شکار ہو گیا۔(۵)

صلیبیوں نے جب ۵۰۲ھ = ۱۱۰۹ء میں طرابلس شام پر قبضہ کیا تو اس عظیم الشان کتب خانے کو مع اس کی عمارت اور کتابوں کے نذر آتش کر دیا، اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صلیبی حملہ آوروں کے ساتھ رہنے والا ایک کاہن اس کتب خانے کے ایک ہال میں داخل ہوا، یہ ہال قرآن کریم کے نسخوں اور تفسیر کی کتابوں کے لیے خاص تھا- اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کتب خانے کی ترتیب موضوعات کے اعتبار سے اور فنی طرز پر تھی- اس ہال سے اس نے ایک کتاب ہاتھ میں لی، دیکھا تو وہ قرآن کریم کا نسخہ تھا، پھر دوسری کتاب اٹھائی تو وہ بھی قرآن کریم ہی تھا، پھر تیسری، چوتھی اور پانچویں کتاب ہاتھ میں

(۱) محمد کرد علی/ خطط الشام: ۶/ ۱۹۷ (۲) تدمری، عمر/ تاريخ طرابلس الحضاری فی القرن الخامس الهجری/ ۶۰-۶۱ (۳) شلبی أحمد / دراسات فی الحضارة العربية الإسلامية: ۱/ ۵۱

(۴) یوسف العش/ دور الكتب العربية العامة وشبه العامة: ۹۷

(۵) عبد اللطیف الصوفی/ لمحات من تاريخ الكتب والمكتبات: ۱۳۴

لی، تقریباً بیس مرتبہ یہی عمل کرتا رہا، جب دیکھا کہ سب کے سب قرآن پاک کے نسخے ہیں، تو اس نے خیال کیا کہ یہ پورا کتب خانہ ہی صرف قرآن کے لیے ہے، اس پر اسے غصہ آیا، اور برافروختہ ہوکر کتب خانہ جلانے کا حکم دے دیا۔ اس کے ساتھ ہی صلیبیوں نے اس کو آگ لگادی، اس آگ نے کتب خانے کے بڑے حصے کو سوخت کردیا، اور جو حصہ باقی بچا تھا، وہ حملہ آوروں کی چیرہ دستیوں کا شکار ہوا، اور اس طرح پورا کتب خانہ جل کر بے نام ونشان ہوگیا۔

اس طرح عرب اسلامی کلچر کا ایک شاندار عوامی کتب خانہ ناپید ہوگیا، اور تعصب، جہالت اور مسیحی کینہ پروری نے ایک ایسی دولت برباد کردی، جس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ حاکم طرابلس فخر الملک بن عمار کی نسبت منقول ہے کہ اس کو جب مسیحیوں کے ہاتھوں طرابلس کے سقوط کا علم ہوا، تو غش کھا کر گر پڑا، اور جب غشی دور ہوئی تو روتے ہوئے کہا کہ: ''خدا کی قسم مجھے کسی چیز کا اتنا غم نہیں جتنا دار العلم کی بربادی کا ہے، اس کتب خانے میں قرآن وحدیث اور ادب غرض علم دین کے ہر شعبے کی تیس لاکھ کتابیں تھیں۔ (۱)

گو بعض یورپی مؤرخوں نے مسیحیوں کے ہاتھوں کتب خانے کے نذر آتش کرنے کے اس حادثے کے بارے میں شک پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، مگر بیشتر مؤرخوں نے اس کے صحیح ہونے پر اتفاق کیا ہے، یہ بات بہت خاص اور اہم ہے کہ ایک چشم دید عیسائی گواہ نے اس واقعے کی شہادت دی ہے اور اس کو بیان کیا ہے، مؤرخ ابن الفرات -متوفی ۸۰۷ھ=۱۴۰۴ء- نے اس واقعے کی حقیقت اور اس کی تمام تفصیلات کو قلم بند کیا ہے۔

نیز اس روایت سے متعدد یورپی مؤرخوں نے اتفاق کیا ہے اور اس کی تائید کی ہے، مثال کے طور پر گبن، طامسن، اور شوشتری وغیرہ نے، اور یہ بات بھی غور کرنے کی ہے کہ آتش زدگی اور تخریب کاری متعصب عیسائیوں کی روح سے مطابقت رکھتی ہے، جن کے دلوں میں پوشیدہ بغض وکینہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ہمیشہ ان کو اکساتا رہتا ہے۔

جہاں تک مسلمان مؤرخوں کا سوال ہے تو ان کو یہی غم کھائے جارہا تھا، کہ یہ دولت مند ملک بغیر کسی جدوجہد کے کینہ پرور دشمنوں کے ہاتھوں میں چلا گیا، لہٰذا ان لوگوں نے تفصیلات میں گئے بغیر

(۱) بثنواولجا/ المكتبات العربية فى العصر العباسى (مجلة العصور) جولائی: ۱۹۸۹ء

صرف کتب خانہ کی آتش زدگی کے ذکر پر اکتفا کیا، ان مؤرخین میں ابن خلکان، ابن الاثیر، اور ابن القاسی رحمۃ اللہ علیہم ہیں۔

خاتمہ:

مذکورہ بالا نمونوں اور مثالوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ عالم اسلام نے اس تابناک دور میں جو تہذیبی اور ثقافتی ترقی کی تھی اپنی پوری تاریخ میں نہیں کی تھی، اور مسلمان حکمرانوں اور فرمانرواؤں نے اس مبارک پیش رفت کو دارالعلم، بیت الحکمۃ، عظیم الشان کتب خانے اور مخطوطات کے مراکز قائم کر کے پایۂ تکمیل تک پہنچایا، اور مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلے ہوئے عالم اسلام کے ان کتب خانوں میں سے ایک کتب خانہ طرابلس بھی تھا۔

عالم اسلام کے اس وقت کے مشہور کتب خانوں اور طرابلس کے ''دارالعلم'' کے درمیان مقابلہ سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ دارالعلم کی کتابوں کی تعداد اسلامی دنیا کے دوسرے تمام کتب خانوں سے کہیں زیادہ تھی۔

جس کتب خانے میں تیس لاکھ کی تعداد میں کتابیں ہوں گی، اس کے لیے ضروری ہوگا کہ اس کی ایک وسیع وعریض عمارت بھی ہو، اس کے اپنے ملازمین ہوں، اس کا عملہ اور نگراں ہوں، اور ان ملازمین کے لیے جن میں نگراں کے علاوہ نسخہ نویس، خطاط، ترجمہ نگار، جلد ساز، وراق، اور محافظ ہوں گے فطری طور پر ایک بجٹ مخصوص کیا جاتا ہوگا۔ ان کتب فروشوں کے لیے بھی بجٹ کا انتظام کیا جاتا ہوگا، جو دنیا کے مختلف خطوں سے نادر اور قیمتی کتابیں فروخت کے لیے لاتے ہوں گے، مزید برآں وہ طلبہ جن کو عطیے اور وظائف دیے جاتے تھے، اور کتب خانے کے انتظام مثلاً فرش فروش، اس کی صفائی ستھرائی، روشنی، قلم، دوات، کاغذ، جلد، الماریاں، اور مرمت وغیرہ کے اخراجات اس کے علاوہ ہوں گے۔

اس دارالعلم کے مختلف سیکشن تھے، ایک تعلیم کے لیے ہال تھا، جہاں درس کے حلقے منعقد ہوا کرتے تھے، دوسرا کتب خانے کے واسطے مخصوص تھا، یہ مطالعہ، نسخہ نویسی کے ہال پر مشتمل تھا، ایک ہال جلد سازی اور تزئین وآرائش کے لیے مخصوص تھا، اور خیال یہ ہے کہ مختلف ہالوں کے درمیان مسقّف گیلریاں ہوں گی۔ جس کے ذریعے وہاں آمد ورفت رکھنے والوں کے لیے ایک حصے سے دوسرے حصے کی طرف آنے جانے میں سہولت ہوتی ہوگی۔ بقیہ صفحہ ۳۹ پر

(ماخوذ)

اورنگ زیب عالمگیر

ولادت: ۱۵/ذیقعدہ ۱۰۲۷ھ =۲۲/اکتوبر ۱۶۱۸ء

وفات: ۲۸/ذیقعدہ ۱۱۱۸ھ=۲۰/فروری ۱۷۰۷ء

جائے ولادت:

[مالوے اور گجرات کی سرحد پر ایک قصبہ دوحد تھا، اس قصبے میں عالمگیر پیدا ہوا تھا، وہ اپنے بیٹے محمد اعظم کو اس کے بارے میں لکھتا ہے:]

''فرزند عالی جاہ! قصبہ دوحد جو صوبہ گجرات کے متعلقات میں سے ہے اس گنہ گار کی جائے پیدائش ہے، وہاں کے باشندوں پر خاص نظرِ عنایت رکھو، کمزور بوڑھے کی جو بڑی مدت سے وہاں کا فوجدار ہے دلجوئی کرو اور اسے بحال رکھو۔ اگر غرض مند لوگ اس کی غیبت کریں تو اسے نہ سنو۔

عنایت بر ضعیفاں گوشۂ چشم دگر دارد

بمہر کوچکِ خود لطفِ دیگر ہست شاہاں را

(کمزوروں پر مہربانی اور نوازش کرنا اپنے اندر ایک نیا لطف رکھتا ہے۔ اپنے سے چھوٹوں پر مہربانی کرنا بادشاہوں کے حق میں اور ہی لطف رکھتا ہے)

جنگِ فیلاں:

جب میں تین روز کم پندرہ برس کی عمر کا تھا تو ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ تیموریوں میں ہاتھیوں کی جنگ دیکھنا شاہانہ شوکت اور وقار کا ایک پہلو سمجھا جاتا تھا۔ ایک دفعہ شاہ جہاں کے حکم سے دو ہاتھیوں کو میدان میں اتارا گیا۔ ایک ہاتھی حریف سے شکست کھا کر بھاگا۔ اس نے اس جانب رخ کیا جہاں میں (عالمگیر) کھڑا تھا، ہاتھی میدان سے نکل گیا مگر فتح مند ہاتھی میری طرف بڑھتا گیا۔ میں اپنی جگہ ڈٹا رہا، میں نے ہاتھی پر حملہ کیا، تلوار اور برچھے نے ہاتھی کو زخمی کیا، ہاتھی نے طیش میں آکر گھوڑے سمیت مجھے ہوا میں اچھالا اور مجھے پاؤں میں روند دینا چاہتا تھا کہ میں بڑی پُھرتی سے اٹھا

اور ہاتھی کے مقابلے پر ڈٹ گیا۔ اتنے میں شجاع اور دوسرے امیر موقع پر پہنچ گئے۔ انھوں نے ہاتھی کو مار بھگایا۔ لوگوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ آخر میدان صاف ہوگیا۔ شاہ جہاں شہزادے کے لیے بڑا مضطرب تھا۔ اس نے اعتماد خان کو حکم دیا کہ وہ جلد شہزادے کو اس کے پاس لائے، میں بڑے وقار اور تمکنت کے ساتھ باپ کی طرف جا رہا تھا، اعتماد خاص نے کہا ''شما آہستہ می آید۔ بادشاہ عجیب حال دارند''۔ میں نے بڑی متانت سے جواب دیا۔ ''اگر فیل ایں جامی بود، من جلدی می کردم۔ الحال چہ اضطراب است''۔ جب میں باپ کے حضور میں پہنچا تو اس نے ایک لاکھ اشرفی مجھ پر سے نچھاور کی اور کہا ''شکر خدائے تعالیٰ کہ بخیر گزشت۔ اگر خدانخواستہ نوع دیگری شُد چہ رسوائی بود''۔ یعنی اگر خدا نخواستہ ہاتھی تمھیں مار دیتا تو بڑی رسوائی ہوتی۔ میں نے تسلیم بجالا کر کہا۔ ''اگر نوعِ دیگری می بود رسوائی نہ بود۔ رسوائی ایں بود کہ از برادران شد'' ع

پردہ پوشی پادشاہاں مرگ است

دریں چہ رسوائی است، یعنی اگر دوسرا معاملہ (موت) ہوتا تو کوئی رسوائی نہ تھی، رسوائی تو اس عمل میں ہے جو بھائیوں کی طرف سے ظاہر ہوا۔

باپ کی نظر میں:

عالمگیر اپنے بیٹے اعظم کو لکھتا ہے:

''فرزند عالی جاہ! یہ واقعہ ایک معتبر شیخ کی زبانی ہم تک پہنچا ہے جسے ہم نے قلم بند کیا ہے تا کہ آپ بھی پڑھ لیں:

ایک روز اعلیٰ حضرت (یعنی شاہجہاں) نے علی مردان خاں اور سعد اللہ خاں کو خلوتِ خاص میں طلب کیا اور فرمایا کہ ملک اور مال کا بندوبست عقل اور انصاف پر مبنی ہے۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ''بے جوہر'' بادشاہ سلطنت کا مالک ہو جائے۔ نااہل کو وزیر امیر اور مصاحب بنالے تو شہروں کا بندوبست بالکل خراب ہو جائے۔ رعایا پریشان ہوگی۔ پیداوار نابود ہو جائے گی۔ ہر طرف ویرانی ہی ویرانی نظر آئے گی۔ تم اللہ کے بندوں اور فقیروں کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے درخواست کرو کہ وہ پانچوں نمازوں کے بعد دعا کیا کریں کہ اس سلطنت کی رونق کم نہ ہو۔ کوئی شخص برا کلمہ زبان پر نہ لائے اور ہمارے بعد ہمارا جو بیٹا بادشاہ ہو اسے خدا نیک توفیق دے۔

بعض اوقات ہمارے دل میں خیال آتا ہے کہ اگر چہ سب سے بڑے بیٹے (داراشکوہ) کے پاس شان وشوکت کا اسباب اور کروفر اور رعب داب کا سب سامان موجود ہے، لیکن وہ نیکوں کا دشمن اور بدوں کا دوست ہے۔

شجاع میں سیر چشمی کے سوا اور کوئی خوبی نہیں ہے۔ مراد بخش ایسا ہے کہ جس کی حالت کا اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔ اسے شراب نوشی کے سوا اور باتوں سے بہت کم سروکار ہے مگر ــــ بیٹا (اورنگ زیب) پختہ مغز، دور اندیش اور مستحکم ارادے کا مالک نظر آتا ہے۔ غالباً یہ سلطنت کا بھاری بوجھ برداشت کرسکتا ہے۔

سعداللہ خاں نے مولانا رومؔ کا یہ مصرع پڑھا ع

مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

شاہ جہاں نے فرمایا ع

تا دوست کرا خواہد میلش بہ کہ باشد

دیکھیں دوست کس کو چاہتا ہے اور اس کی رغبت کس کی طرف ہوتی ہے۔

آنے والا دور:

عالمگیر نے اپنے ایک بیٹے کو عبرت دلانے اور خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لیے یہ لکھا:

فرزند دل بند! علی مردان خاں، سعید میرزا اور قلیچ خاں شاہجہانی کا یہ قاعدہ تھا کہ چوکی پہرہ کے دن سپاہیوں کی تواضع پہلے قہوہ سے کرتے تھے۔ پھر حاضری کے وقت حاضری اور چاشت کے وقت چاشت کھلاتے تھے، رخصت کے وقت عطر اور پان دیتے تھے۔ ان لوگوں کے گھروں میں قسم قسم کے کھانے بھیجتے اور کہتے تھے کہ ان کی عورتیں اور بچے ان کی تنہا خوری پر طعن نہ کریں۔

گذشتہ زمانے میں ایک شخص ایک بزرگ کے پاس گیا اور زمانے کی شکایت کی۔ اس بزرگ نے فرمایا کہ اس وقت اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر اور سپاس ادا کرنا چاہئے کہ انسان کو نہ روٹی کا خوف ہے نہ مال وجان کا غم اور نہ دین وایمان کی سستی کا اندیشہ، آئندہ زمانے میں دنیا والوں کی نیتوں میں فتور آجائے گا۔ قسم قسم کے ظلم وستم ہوں گے۔ عدل وانصاف احسان وشکر کا نام ونشان تک باقی نہ

ہوگا۔شہروں کے محافظ اورصوبوں کے ناظم کھلم کھلا لوٹ مار کی طرف مائل ہوجائیں گےاور بادشاہ بھی دادخواہوں سے چشم پوشی کرے گا۔امیر لوگ ایک دوسرے کی مصلحت سے ظالموں کو مدد دینے میں کوشش کریں گے۔ سچ زائل اور باطل ہوجائے گا۔عورتیں بے باک ہوں گی۔لڑکیاں وزارت کے عہدے پر سرفراز ہوں گی۔عالی مرتبہ لوگ بے دل ہوجائیں گےاور ناقدری کی وجہ سے جان بوجھ کر کاموں کی درستی کی طرف سے غافل ہوجائیں گے۔قابل اور اہل لوگ گوشہ نشینی کے باوجود امن وامان میں نہ ہوں گے۔ بے وقوف اور ناتجربہ کار لوگ حکومت کریں گے۔لڑکے باپ کو تکلیف دیں گےاور باپ کے دل سے شفقت کا جذبہ اٹھ جائے گا، نیک عورتیں بُرے شوہروں کی بدکاری اور بے توجہی سے نالاں ہوں گی۔ بارش وقت پر نہ ہوگی۔حاکم غلہ کو کنجوسی کی غرض سے زیادہ مہنگا بکوائیں گے۔ملک حاکموں کے ظلم سے ویران ہوجائیں گے۔ بادشاہوں اور بڑے خانوں کے گھروں میں زانیہ عورتیں کھلم کھلا رہنے سہنے لگیں گی اور مرد عورتوں کا لباس پہننے کی خواہش کریں گے۔

عالمِ شہزادگی:

عالمگیر، معظم کو امرا سے بہتر تعلق پیدا کرنے کی تلقین کرتا ہوا اپنی شہزادگی کا حال یوں سناتا ہے:

مہین پور خلافت! عقلمند اور خوش اخلاق ہونے کے باوجود تم نے فتح اللہ خاں کو کیوں ناراض کردیا ہے۔ہم شہزادگی کے زمانے میں امرا سے اتنا اچھا سلوک کرتے تھے کہ ہم سے سب خوش تھے۔ سامنے اور پیٹھ پیچھے ہماری تعریف کرتے تھے۔ اس کے خلاف برادر نامہربان (داراشکوہ) کے بااختیار ہونے کے باوجود بعض آدمی اس کا ساتھ چھوڑ کر ہم سے آملے تھے اور جن لوگوں نے برادر نامہربان کے اشارے سے ناشائستہ حرکات کرکے گستاخی کے کلمات استعمال کیے تھے۔ہم نے چشم پوشی کی اور بردباری کے تازیانے سے ان کی تنبیہ کی۔انھوں نے انصاف سے کام لے کر ہمارے عالی حوصلہ ہونے کا اقرار کیا۔ یہاں تک کہ اعلیٰ حضرت (شاہ جہاں) کے دل پر ہماری بہادری اور سرداری کا نقش بیٹھ گیا اوراس کمزور چیونٹی کے بازوؤں کے زور سے بڑے بڑے کارہائے نمایاں انجام پذیر ہوئے۔تم نے فتح اللہ خاں جیسے شخص کو ناراض کرکے ایک ایسے جفاکش بہادر سپاہی کا دل توڑ دیا ہے جو تمھارے بہت کام آسکتا تھا۔

گر صد ہزار لعل و گہر می دہی چہ سُود
دل را شکستۂ نہ کہ گوہر شکستۂ

(اگر تم بے شمار لعل و گہر بھی دے دو تو کیا فائدہ، تم نے ایک دل توڑا ہے نہ کہ گوہر) اب جو کچھ ہوا سو ہوا، اس کی دلجوئی کرو تو بہتر ہے، کیونکہ معاملات کو ٹھیک کرنے کے لیے یہی مفید ہے۔ آئندہ تمھاری مرضی، اس شخص پر سلامتی ہو، جو سیدھے راستے پر چلا۔

غیروں کا تمدن:

محمد معظم کو غیر مسلموں کا تمدن اختیار کرنے سے روکنے کی خاطر لکھتا ہے:

بیٹے! ایک بے غرض آدمی کی عرض داشت سے معلوم ہوا کہ تم نے اس سال ایرانیوں کی طرح جشنِ نوروز بڑے دھوم دھام سے منایا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے تمھارے اعتقادات درست ہیں۔ پھر تم نے یہ تازہ بدعت کس سے سیکھی ہے۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس عرب نے جو سید کہلاتا ہے اور نیکوں کو بدنام کرنے والا ہے، تمھیں اس قسم کی تعلیم دی ہوگی۔ بہر حال چونکہ یہ دن آتش پرستوں کی عید ہے اور ہندوستان کے ہندوؤں کے نزدیک راجہ بکرماجیت کے جلوس کا دن ہے اور ہندی سنہ کی ابتدا اسی سے ہوتی ہے، اس لیے آج سے یہ دن نہ منایا جائے اور اپنی جہالت کا اظہار نہ کیا جائے۔

گفتہ گفتہ من شدم بسیار گو
از شما یک تن نہ شد اسرار جو

(میں نے کہتے کہتے بہت کچھ کہہ ڈالا ہے مگر تم میں سے کوئی بھی جویائے اسرار نہیں ہوا)

ایک اور رقعہ میں اسی قسم کی ایک حرکت پر محمد معظم کو تنبیہ کرتا ہے:

ایک تحریر سے معلوم ہوا ہے کہ تم سر پر کیسری چیرا باندھے اور حلوان کا کرتا پہنے دربار لگاتے ہو۔ آپ کی عمر چھیالیس سال کی ہو چکی ہے۔ اس سن و سال اور داڑھی مونچھ پر یہ نخرہ؟

روزمرہ کے مشاغل:

عالمگیر اپنے بیٹوں کو جفاکشی اور سلطنت کے معاملات میں انہماک سے حصہ لینے کی تلقین کرتا ہوا شاہ جہاں کے یومیہ پروگرام (جس پر کہ وہ خود بھی بڑی سختی سے عمل پیرا ہوتا تھا) کا نقشہ پیش کرتا ہے:

''شاہجہاں فرمایا کرتے تھے کہ شکار بے کاروں کا مشغلہ ہے۔ انسان اگر عاقبت کے کاموں میں مشغول نہیں ہوسکتا تو اسے دنیا کے کام سنوارنے میں کیا برائی نظر آتی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ کیونکہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے۔ شاہ جہاں بہ نفس نفیس چار گھڑی رات رہے خواب گاہ سے باہر آ کر توفیق کے آبشار سے وضو کرتے اور ورد و وظائف میں مشغول ہو جاتے تھے، صبح صادق سے پہلے اور نماز کی اذان کے بعد فاضل عالموں کی جماعت کے ساتھ صبح کی نماز پڑھ کر جھروکہ درشن میں تشریف لاتے تھے اور درشن کرنے والوں کو اپنے دیدار کی سعادت سے مشرف فرما کر چار گھڑی دن چڑھے دیوانِ عام میں تشریف لے آیا کرتے تھے۔ اس دربار میں تمام چھوٹے بڑے منصب دار حاضر ہو کر مجرا بجا لاتے تھے، دیوانِ اعلی اور میر بخشی اہلِ خدمات کی تجویز اور صوبوں کے کروڑیوں، امینوں، فوجداروں، اور ناظموں کی جان نثاری اور حسنِ خدمت کے واقعات عرض کر کے ہر شخص کی امید کا دامن گلہائے مراد سے بھر دیتے۔

پھر خاصہ کے گھوڑوں اور ہاتھیوں کے ملاحظہ کے بعد ایک پہر دو گھڑی دن چڑھے دیوان عام سے دیوانِ خاص کو رونق بخشتے تھے۔ اس مقام پر بلند مرتبہ رکھنے والے بخشی، نئے منصب داروں کے حالات عرض کرتے اور اعلیٰ حضرت سے نظر ثانی کا حکم لیتے۔ ہر صوبہ کے حالات و واقعات کا خلاصہ مجمل طور پر بیان کر کے ہر معاملے کے متعلق بادشاہ کا آخری حکم حاصل کرتے تھے۔ یہ سلسلہ تقریباً دو پہر تک جاری رہتا۔ اس کے بعد خاصہ کے کھانے کی طرف متوجہ ہو کر جسم کی مضبوطی اور عبادت وانصاف کی قوت حاصل کرنے کے لیے اس میں سے تھوڑا سا نوش فرماتے۔ وظیفہ خوار روزینہ دار وابستگانِ دامن کے کھانے کے متعلق جن میں سے اکثر عالم، فاضل، طالب علم، مسکین، غریب، یتیم، بے کس اور بے یار و مددگار ہوتے تھے اور ان میں اکثر ایسے ہوتے جنھیں اعلیٰ حضرت پہچانتے تھے، دریافت کر کے خاص خواب گاہ میں تشریف لے جاتے تھے۔ وہاں تھوڑا عرصہ آرام فرماتے مگر ان کا دل پھر بھی بیدار رہتا تھا۔ پھر دو پہر چار گھڑی دن گئے خواب گاہ سے باہر آ کر وضو کرتے اور نماز خانے میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہو جاتے۔ ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد وظیفہ کرتے اور ہاتھ میں تسبیح لیے ہوئے برج اسد میں آ کے بیٹھ جاتے۔ دیوانِ اعلی وہاں حاضر ہوتا اور مالی وملکی معاملات عرض کر کے اکثر کاغذات پر دستخط کراتا۔

چار گھڑی دن رہے پھر دیوان عام لگاتے۔ اس وقت بخشی اور میر بیوتات نئے منصب داروں اور جاگیر کے طالبوں کو حضور میں پیش کرتا۔ اعلیٰ حضرت بڑے غور و خوض کے بعد ذاتی لیاقت اور خاندانی حالات کی تحقیق کر کے اس کا منصب اور جاگیر مقرر کرنے کا حکم صادر فرماتے۔

شام کے بعد دیوانِ عام سے اٹھ کر مغرب کی نماز پڑھتے اور خلوت خانے میں تشریف لے جاتے۔ وہاں شیریں بیان مورخ اور قصہ خواں، خوش الحان قوال اور جہاں گرد سیاح حاضر ہوتے۔ پردے کے اندر عورتیں اور پردے کے باہر مرد بیٹھتے، ہر شخص ملکوں کے عجیب و غریب تحفے پیش کرتا۔ مورخ اور قصہ خواں قدیم بادشاہوں اور بزرگوں کے حالات بادشاہ کو سناتا۔ الغرض اعلیٰ حضرت آدھی رات تک اپنے شب و روز کے اوقات اس طریق پر تقسیم فرما کر زندگی اور حکومت کی داد دیتے تھے۔

چونکہ ہمیں تم سے دلی پیار اور محبت ہے اور یہ محبت اور پیار جھوٹا اور بناوٹی نہیں ہے۔ اس لیے جو کچھ بھی مناسب معلوم ہوا اور تم جیسے فرزند ارجمند کے حق میں بہتر اور مناسب نظر آیا اسے ہم نے بے اختیار لکھ دیا ہے۔

اولاد کی تربیت:

عالمگیر اپنے بیٹوں کی تربیت جس طرح کرنی چاہتا تھا اس کا پتہ ان واقعات سے ہو سکتا۔ وہ محمد اعظم عالی جاہ کو لکھتا ہے:

''معلوم ہوا ہے کہ تم سواری کے وقت گھوڑے کو بڑی تیزی سے دوڑاتے ہو۔ چنانچہ تمھارا چتر بردار جو سید ہے گرا اور گرتے ہی مر گیا۔ تم ایک مدت تک میرے پاس رہے اور سواری کے طور طریقوں میں مہارت حاصل کی۔ پھر تم نے ایسا کیوں کیا۔

آہستہ خرام بلکہ مخرام
زیرِ قدمت ہزار جان است

ایک دوسرے موقع پر محمد اعظم کو لکھتا ہے:

کوڑا کا چکلہ دار حسن بیگ اب تک معزول نہیں ہوا۔ وہاں کی رعایا واویلا کرتی ہے اور پتھروں سے سر پھوڑ پھوڑ کر کہہ رہی ہے۔ ع

اگر تو می ندہی داد روزِ دادے ہست

اصل محاسب حاکموں کے ظلم وستم کو ہمارے اور تمھارے حساب میں لکھ رہے ہیں۔ اعمال کی سزا یعنی آخرت کی آمد پر ایمان رکھتے ہوئے وہاں کے باشندوں کے ساتھ انصاف کرو اور دادرسی سے کام لو۔ اگر ایسا نہ کروگے تمھاری جاگیر بدل دی جائے گی اور تمھیں اس کا بدلہ ملے گا۔

اچھے کارکنوں کی تلاش:

عالمگیر کو ہمیشہ خواہش رہی کہ اسے اچھے کارکن میسر آئیں وہ ان کی تلاش میں رہتا۔ چنانچہ وہ اپنے بیٹے کو لکھتا ہے:

''ایک روز سعد اللہ خاں درود و وظائف سے فارغ ہونے کے بعد دیر تک دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے رہا۔ ایک گستاخ مصاحب نے یہ کیفیت دیکھ کر پوچھا کہ ''اب کیا آرزو باقی ہے''؟ اس نے کہا، ''اچھے آدمی کی ضرورت ہے'' واللہ اس نے خوب کہا۔ اگر چہ انسان میں دیانیت و امانت کا جوہر فطری اور خداداد ہوتا ہے، لیکن اس میں آقا کی ہمت اور انصاف کو بھی دخل ہوتا ہے۔ اس کا فرض ہے کہ اپنے ملازم کو فکرِ معاش کی طرف سے فارغ البال اور خوش حال رکھے تا کہ وہ دنیا کی ضروریات سے پریشان نہ ہو اور اس طرح اس کے اعتقاد میں خلل پیدا نہ ہو کہ ع

مزدور خوش دل کند کار بیش

حوصلہ افزائی:

اسی سلسلے میں ایک دیانت دار ملازم کی حوصلہ افزائی کرنے کے لیے اعظم کو لکھتا ہے:

''معلوم ہوا ہے کہ تمھارا دیوانِ خاص مصطفیٰ قلی بیگ اپنے فرائض بڑی احتیاط اور دور اندیشی سے بجا لاتا ہے۔ یہ بہت غنیمت ہے۔ اگر تم لکھو تو اس کے منصب میں اضافہ کر کے اسے ''خان'' کا خطاب دے دیا جائے۔ اچھے آدمی خالص سونا ہوتے ہیں جو بہت کمیاب اور بیش بہا ہیں۔

آنچہ پُر جستیم وکم دیدیم بسیار است ونیست
نیست جُز انساں دریں عالم کہ بسیار است ونیست

یعنی جس چیز کو ہم نے بہت تلاش کیا اور کم پایا وہ اس جہان میں انسان کے سوا اور کوئی چیز نہیں جو بہت بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔

ایک اور رقعہ میں عالمگیر لکھتا ہے:

''صوبہ مالوہ کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ پہاڑ سنگھ بد باطن جس نے تکبر اور غرور کے نشے میں چور ہوکر شورش اور فساد برپا کیا تھا اور جو اس علاقہ میں فتنہ اور فساد کی جڑ تھا وہ اب اس با اقبال اور عالی مقام فرزند کے نائب دیوان تلوک چند کے ہاتھ سے مارا گیا ہے۔

اصل میں اس واقعہ کا ظہور تمھارے فیض تربیت کا نتیجہ ہے۔تم نوکروں کی دلجوئی کرکے انھیں سلطنت کے عمدہ کاموں میں مصروف رکھتے ہو۔اس وجہ سے ہم زبانی زبانی مبارک باد نہیں دیتے بلکہ تمھیں موتیوں کی مالا جس کی قیمت پچاس ہزار روپے ہے۔عطا کرتے ہیں۔تلوک چند نے اپنے فعل سے یہ مثل سچ کر دکھائی ہے کہ چڑیا نے بہادری سے کام لے کر باز کو مار ڈالا ہے۔اس لیے ہم اسے بھی پانصدی ذات اور دوصد سوار کا منصب دیتے ہیں۔اسے ''رائے'' کا خطاب خلعت، شمشیر اور گھوڑا بھی انعام کو طور پر عطا کرتے ہیں۔تم بھی تلوک چند کے مرتبے میں ایسا مناسب اضافہ کردو جس سے وہ اپنے ہم سروں میں ممتاز ہوجائے۔واجب یہ ہے کہ تحسین و آفرین کے ساتھ اسے صوبے کی نیابت پر مستقل کردو تاکہ دوسرے نوکروں کے دل میں حُسن خدمت کا جذبہ بیدار ہو۔

خلعت و بے پروائی:

عالمگیر اپنی ساری سلطنت پر نظر رکھتا تھا۔معمولی سے معمولی واقعہ بھی اس کی نظر سے اوجھل نہیں ہوتا تھا۔اس مقصد کے لیے اس نے خفیہ نویس مقرر کیے ہوئے تھے جو اسے ذرا ذرا سی بات پہنچاتے تھے، وہ اپنے بیٹے کو اس کی غفلت پر سرزنش کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''فرزند عالی جاہ! جاسوسوں کی اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ بلاول پور سے خجستہ بنیاد تک شاہراہ پُرخطر ہے، ڈاکو بیوپاریوں اور مسافروں کا مال لوٹ لیتے ہیں۔عوام امن و امان کے ساتھ سفر نہیں کرسکتے۔ جب ہمارے اور تمھارے لشکروں کے قرب و جوار میں یہ حالت ہوگی تو دور دراز راستوں کی کیفیت کتنی افسوس ناک ہوگی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مخبر تمھیں معتبر خبریں نہیں بھیجتے۔چونکہ غفلت اور بے پروائی حکومت اور جہاں بانی کے اصول کے خلاف ہے۔اس لیے تم نئے محرر مقرر کرو اور پہلے عملے کو سزا دو اور ایک ہوشیار فوج مقرر کرکے ان فتنہ پردازوں کی بیخ کنی کرو۔شاہراہ کو ڈاکوؤں کی تاخت و تاراج اور وجود سے پاک کردو۔بدنظمی کی یہ لعنت کیسے اور کب تک گوارا ہوسکتی ہے ۔

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سود باش
اے زفرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

فقیروں کی خدمت:

عالمگیر میاں عبداللطیف برہانپوری کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا۔ وہ ان کے فیضان اور نصائح سے ایک مدت تک مستفید ہوتا رہا۔ اپنے بیٹے کو ایک صحبت کا حال لکھتا ہے:

''ہمیں یاد پڑتا ہے کہ ایک روز ہم میاں عبداللطیف قدس سرہ الشریف کی خدمت میں گئے۔ دورانِ گفتگو ہم نے کہا کہ اگر اجازت ہو تو کھرکھون کے آس پاس کے چند گاؤں خانقاہ کے اخراجات کے لیے وقف کر دیئے جائیں، اس پر انھوں نے اپنی زبان سے فرمایا۔

شاہ مارا دہ دہد منت نہد
رازقِ ما رزق بے منت دہد

(بادشاہ ہمیں گاؤں دے کر ممنونِ احسان کرتا ہے لیکن ہمارا رازق (اللہ تعالی) ہمیں بغیر احسان کے رزق دیتا ہے)

ہم نے کہا: ایسا ہی ہے لیکن فقیروں اور اللہ والوں کی خدمت کرنا دنیوی خیر و برکت، اپنے آرام و آسائش اور نعمت اور دولت کی زیادتی کی دعا کے لیے ہے نہ کہ حرص و احسان کے لیے۔ میاں صاحب نے فرمایا: اگر واقعی تمھارا ارادہ پختہ اور نیت نیک ہے تو ہم رعایا کے حصے میں سے نصف غلہ لے لیں گے، بلکہ جفاکش مظلوموں کے لیے اس سے بھی زیادہ چھوڑ دیں گے۔ تم اللہ تعالیٰ پر بھروسہ رکھنے والے گوشہ نشینوں کے لیے جو زبانِ سوال بند کیے بیابانوں اور ویرانوں میں رہتے ہیں۔ دائمی وظیفہ مقرر کر دو اور مظلوموں کی اس طرح دادرسی کرو کہ کسی کا حق ضائع نہ ہو۔ طاقتور کمزوروں کو تنگ نہ کر سکیں۔

چکلہ کوڑہ کے باشندوں کی نالش کے موقع پر ہمیں یہ نقل یاد آئی جو بے اختیار تمھیں لکھ دی گئی ہے۔

فقیروں کی دعا:

اسی طرح احمد آباد گجرات میں ایک درویش میر عرب نامی رہتا تھا۔ عالمگیر اس سے بھی متاثر تھا۔ ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

''تم نے احمد آباد گجرات میں میر عرب درویش کو دیکھا ہے۔ وہاں دوبارہ جاؤ اور اس شرمندۂ عاقبت اور طالبِ دنیا کا سلام اسے پہنچاؤ اور صدق دل سے انجام کار کی اچھائی اور ایمان کی سلامتی کے

لیےان سے دعا چاہو۔کہوموت کا وقت قریب آ پہنچا ہے،اور میں اعمال نیک سے دور ہوں،اس غافل کی عمر بے سود گزر گئی اوراب جس قدر باقی ہے۔وہ بھی بے فائدہ گزر رہی ہے۔زندگی کا قدم آگے بڑھتا ہےاور نجات کی فکر پس پشت ہے۔

آنچہ ما کردیم بر خود ہیچ نابینا نہ کرد
درمیانِ خانہ گُم کردیم صاحب خانہ را

نصائح:

عالمگیراپنے لڑکوں کومختلف طریقوں سے نصیحت کیا کرتا تھا۔ایک موقع پروہ سعداللہ خاں کی بیاض کے حوالے سے کچھ نصیحتیں لکھتا ہے۔ یہ نصیحتیں جہاں بانی وجہاں داری کے سلسلے میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں:

سلطنت کا قیام انصاف سے ہوتا ہے، ملک و مال کی زیادتی بہادری اور سخاوت سے ہے۔ عالم اور فاضل لوگوں کے ساتھ صحبت رکھنا جاہلوں سے پرہیز کرنا عقل مندی کا نشان ہے۔اپنے عقائد پرعمل کرنا عین مصیبت کے عالم میں مستقل مزاج رہنا، تدبیر سے خوش اور تقدیر پر شاکر رہنا، خاندان کے دائمی قیام کی بنیادیتیموں پررحم کرنے اورمحتاجوں کی حاجت روائی سے گریز نہ کرنے پر ہے۔ملکی کام وزیروں کے صلاح مشورے سے انجام پاتے ہیں۔ فتح وکامرانی فقیروں کی دعا سے اور تندرستی درد مندوں کا درد دور کرنے سے نصیب ہوتی ہے۔ مجرموں کے گناہ معاف کر کے خدا کی جناب سے رحمت کی امید رکھنی چاہیئے۔

ہم نے چاہا کہ تنہا ہی ان سے لطف اندوز نہ ہوں اس لیے یہ نصیحتیں تم کو بھی بھیجی ہیں، خدا سب کوعمل کی توفیق دے۔

آخری وصیت:

جب اورنگ زیب کا آخری وقت قریب آیا تو اس نے یہ فرمان سب بیٹوں کے پاس بھیجا:

بڑھاپا آ گیا، کمزوری زیادہ ہوگئی، اعضا میں قوت نہیں رہی، دنیا میں یگانہ (تنہا) آیا تھا۔ اب سب سے بیگانہ جارہا ہوں۔ مجھے اپنے آپ کی خبر نہیں کہ کون ہوں اور کس کام کے قابل ہوں، جو دم عبادت کے بغیر گزرا اُس کا افسوس باقی ہے۔حکومت اور رعیت پروری کوئی مجھ سے نہ بن آئی، قیمتی عمر مفت میں ضائع ہوگئی۔گھر کا مالک (خداوند تعالیٰ) تو موجود ہے لیکن میں اپنی تاریک آنکھ میں اس

کی روشنی نہیں دیکھتا۔زندگی پائدار نہیں۔گزرے ہوئے دم کی نشانی ظاہر نہیں اور مستقبل کے متعلق کوئی امید نہیں۔تپ نے جدائی اختیار کی اور چمڑے کو تنہا چھوڑ دیا۔

فرزند کام بخش اگرچہ بیجاپور چلا گیا ہے۔لیکن وہ نزدیک ہے بلکہ وہ عالی جاہ (اعظم) سے بھی زیادہ نزدیک ہے۔عزیز القدر شاہ عالم بہادر سب سے زیادہ دور ہے۔فرزندزادہ محمد عظیم اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہندوستان کے نزدیک پہنچ گیا ہے۔فوج کے آدمی سب کے سب بے دست وپا مضطرب وپریشان اور میری طرح بےقرار ہیں، جو اپنے خداوند حقیقی سے علیحدگی اختیار کرکے بےتابی کی حالت میں ہے اور پارہ کی طرح تڑپ رہا ہے۔وہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ہم پر بھی ایک حاکمِ اعلیٰ ہے۔میں اپنے ساتھ کچھ نہیں لایا تھا، مگر افسوس گناہوں کا بوجھ ساتھ لے جا رہا ہوں۔اگرچہ اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم پر نظر اور اس کی رحمت سے قوی امید ہے، لیکن اپنے اعمال وافعال کو دیکھتے ہوئے ہر وقت ڈر لگا رہتا ہے۔

اگرچہ پروردگار اپنے بندوں کی حفاظت کرے گا، لیکن ظاہری حالات پر نظر رکھتے ہوئے فرزندوں پر بھی واجب ہے کہ خلق خدا اور مسلمان ناحق نہ مارے جائیں۔فرزندزادہ بہادر کو آخری دعا کہہ دیں۔ہم نے رخصت کے وقت اسے نہ دیکھا شوق باقی رہا۔بیگم (نواب بائی والدہ کام بخش) اگرچہ رنجیدہ خاطر ہے لیکن دلوں کا مالک خدا ہے۔عورتوں کی کوتاہ اندیشی ناکامی کے سوا اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتی۔الوداع۔الوداع۔الوداع۔

(مرتب: محمد علم الدین سالکؔ)

☆☆☆☆☆☆☆

صفحہ ۲۷ کا بقیہ

لیکن تو اپنی بات پر اڑا رہا، اب پوپ نے ایسا کیا تعویذ دے دیا کہ تو ایک منٹ میں سیدھا ہو گیا اور پائی پائی دینے کے لیے تیار ہو گیا، بس مجھے وہ تعویذ دکھا دے تاکہ میں اس کو پڑھ لوں، عیسائی نے کہا کہ اس کو پڑھنے کی کیا ضرورت ہے تمہارا مقصد تو پورا ہو گیا لیکن مسلمان بضد رہا کہ میں تو ضرور پڑھوں گا، آخر اس میں ایسا کیا لکھا ہے کہ تم ذراسی دیر میں پائی پائی دینے کے لیے تیار ہو گئے، عیسائی نے کہا کہ اچھا یہ لو اور پڑھ کر دیکھ لو، اس مسلمان نے جب وہ پوپ کی پرچی کھول کر پڑھی تو اس میں لکھا ہوا تھا کہ:

کیا تو بھی مسلمانوں کی طرح جھوٹ بولنے لگا ہے۔

ماخوذ

ایک عبرت ناک واقعہ

حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ سنایا تھا کہ یورپ کے اندر کسی شہر میں ایک عیسائی اور ایک مسلمان میں دوستی تھی اور دوستی اتنی کہ سگے بھائیوں سے بڑھ کر، دونوں ایک دوسرے سے بے تکلف اور ہر دم ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے، اسی دوران انھوں نے مشترکہ طور پر کوئی کاروبار شروع کیا، عیسائی نے بھی سرمایہ لگایا اور مسلمان نے بھی سرمایہ لگایا، چونکہ دونوں میں پکی دوستی تھی اور شیر وشکر تھے، لہٰذا کوئی تحریر بھی نہیں لکھی، کوئی دستاویز بھی تیار نہیں کی، پس زبانی ہی آپس میں باہمی رضامندی سے شرکت کرلی اور کاروبار شروع کردیا اور کاروبار بھی خوب چلا، لاکھوں سے کروڑوں اور کروڑوں سے اربوں ہوگئے، جب یہ کاروبار بہت پھیل گیا اور اس قدر نفع بخش ہوگیا تو عیسائی کی نیت بدل گئی، ایک دن اس نے مسلمان سے کہہ دیا کہ تیرا تو کچھ بھی نہیں ہے تو کون ہے، میرا تیرا کیا واسطہ؟ مسلمان یہ سن کے دیکھتا کا دیکھتا ہی رہ گیا، اس بیچارے کے طوطے اڑ گئے، اس نے کہا بھئی ہم دونوں دوست ہیں اور دوستی میں ہم نے یہ کاروبار مشترکہ طور پر شروع کیا ہے جو یہاں تک پہنچا ہے، اب تم یہ کیسی بات کررہے ہو؟ عیسائی نے کہا کہ میں صحیح کہہ رہا ہوں، اب چونکہ مسلمان باہر کا تھا، اور وہ عیسائی اسی ملک کا تھا، لہٰذا جہاں بھی مسلمان جائے، اس کی بات کو رد کرکے عیسائی کی بات ہی مانی جائے، مسلمان کے پاس کوئی ثبوت ہی نہیں تھا، ایک تحریر کا پُرزہ بھی نہیں تھا کہ جس میں ان کا آپس میں کوئی معاہدہ لکھا ہوا ہو اور شرکت لکھی ہو، جب کہ زبان کا کوئی اعتبار نہیں، اس لیے ہر جگہ یہ مسلمان ناکام ہوا، عدالت میں بھی ناکام ہوا، ثالثوں کے سامنے بھی ناکام ہوا، بیچارہ مسلمان ہر جگہ سے ناکام، نامراد اور مایوس ہوگیا، اور عیسائی نے پورے کاروبار پر قبضہ کرلیا، اس عیسائی کو دوسرے عیسائیوں نے بھی بہت سمجھایا کہ ہم سب جانتے ہیں، تمھارا آپس میں جو تعلق ہے ہمیں معلوم ہے، تم یہ کیا کررہے ہو اور کیسی باتیں کررہے ہو، دنیا کی چند روزہ زندگی کی خاطر اپنے ایک دوست اور بھائی سے ایسا معاملہ کر رہے ہو جو کسی طرح بھی درست نہیں ہے، یہ تم کیوں کررہے ہو؟ مگر اس کی عقل میں نہ آنی تھی اور نہ آئی، بہر حال وہ قبضہ کرکے بیٹھ گیا اور مسلمان مایوس ہوکر بیٹھ گیا، پھر یہ مسلمان اتنا مفلس ہوگیا کہ اس

کے پاس رہنے کی جگہ بھی نہیں تھی اور کرایہ دینے کے لیے پیسے بھی نہیں تھے، وہ کھانے پینے کا بھی محتاج ہوگیا، اس لیے کہ اس کے پاس جو کچھ تھا وہ سب اس نے کاروبار میں لگا دیا تھا جو سارا ہی چلا گیا، اس واقعہ کو ابھی کچھ روز گزرے ہی تھے کہ ایک دن اس مسلمان کو ایک دوست نے ایک ترکیب بتائی کہ تم ایسا کرو کہ ان عیسائیوں کا جو سب سے بڑا پوپ ہے، اس کے پاس جاؤ اور اس کو اپنا پورا قصہ بتاؤ، وہ ان کے چونکہ مذہبی پیشوا اور رہنما ہیں، شاید ان کی بات اس کے دل پر اثر کر جائے اور وہ اس کو سمجھائیں اور یہ مان لے، اس طرح سے بگڑی بن جائے اور تمہاری مشکل حل ہو جائے میرے سے تمہارا حال دیکھا نہیں جاتا، پہلے تمہاری کیا شان تھی اب کس حال میں ہو، اس نے کہا کہ آؤ چل کر دیکھ لیتے ہیں، بہت کچھ کیا امید تو نہیں ہے، تم کہہ رہے ہو تو چلو دیکھ لیتے ہیں، لہٰذا اس عیسائی کے شہر میں جو سب سے بڑا پوپ تھا، اس سے اس نے وقت لیا اور وقت لے کر اس کے پاس گیا اور وہاں جا کر اس نے شروع سے آخر تک اپنا سارا قصہ سنایا کہ اس طریقہ سے ہماری دوستی ہوئی اور پھر ہم دوستی میں اتنے آگے بڑھ گئے اور ہمارے تعلق میں اتنا اعتماد پیدا ہو گیا کہ ہم نے آپس میں سرمایہ لگا کر کاروبار کیا لیکن کوئی تحریر نہیں لکھی اور جب کاروبار چمک گیا اور کامیاب ہو گیا تو اس نے طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں اور انکار کر دیا کہ اس کاروبار میں تیرا کوئی پائی پیسہ نہیں ہے، یہ جو کچھ ہے سب میری محنت ہے، اب میرے پاس کوئی ثبوت ہی نہیں ہے اس لیے میں تمام مقامات پر ثبوت نہ دینے اور گواہ پیش نہ کرنے کی وجہ سے ناکام ہو گیا اور وہ جیت گیا، اب آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ اس سلسلے میں میری کچھ مدد کر سکتے ہیں تو کر دیں۔ پوپ نے دراز میں سے ایک چھوٹا سا کاغذ نکالا اور اس میں ایک سطر لکھی اور اس کو موڑ کر اس مسلمان کو دیا اور کہا کہ یہ جا کر اس عیسائی کو دے دینا، یہ مسلمان چھوٹی سی پرچی لے کر چلا، وہ عیسائی اپنے آفس میں بیٹھا کاروبار کر رہا تھا، یہ اس کے آفس میں گیا اور اس کو یہ پرچی دیتے ہوئے بتایا کہ میں فلاں پوپ کے پاس گیا تھا اس نے یہ پرچی دی ہے، اس نے پرچی پڑھی اور فوراً اپنی دراز سے چیک بک نکالی اور مسلمان کی اصل رقم اور کاروبار کے آغاز سے اب تک جتنا بھی نفع ہوا تھا، وہ سب جوڑ کر اس کو پوری رقم کا چیک دے دیا، یہ مسلمان ایک تو اس وقت حیران ہوا تھا جب اس نے انکار کیا تھا اور اب یہ چیک دیکھ کر حیران ہو رہا تھا، عیسائی نے کہا کہ تم بےفکر رہو، جو ہوا سو ہوا، اب تمہاری پائی پائی جوڑ کر اس کا چیک بنا دیا ہے اور یہ کیش ہو جائے گا، مسلمان کو یقین نہ آئے، اس نے کہا کہ اللہ کے بندے! ہر کسی نے تجھ کو بتایا اور سمجھایا بقیہ صفحہ ۷۰ پر

اہل علم کے خطوط بنام حضرت محدث کبیرؒ

(مکاتیب حضرت مولانا محمد منظور نعمانیؒ)

ترتیب: مسعود احمد الاعظمی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ-۴؍شوال المکرّم ۷۷ھ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم، سلام مسنون۔

خدا کرے مزاج سامی بعافیت ہو۔ نہایت جلدی میں اس وقت یہ عریضہ ایک ضرورت سے لکھ رہا ہوں۔

میں اس وقت ''سیاست وحکومت'' کے موضوع پر کچھ لکھ رہا ہوں، میں نے کبھی پہلے بھی زبانی عرض کیا تھا، یہ مسئلہ خاص توجہ کے قابل ہے کہ جن ممالک میں اقتدار مسلمانوں کا نہیں ہے، جو پوزیشن مثلاً ہندوستان کی ہے کہ یہاں کی حکومت بہر حال اسلامی نہیں ہے، تو ایسی حکومت کے مسلمان شہریوں کے ملکی سیاست وحکومت میں حصہ لینے کی شرعی کیا حیثیت ہے اور اس کی کیا حدود وشرائط ہیں؟

اب میں اس پر خود ہی کچھ لکھ رہا ہوں:

۱:- مجھے یاد آتا ہے کہ غالباً سیر کبیر میں مہاجرین حبشہ کے متعلق یہ نقل کیا گیا ہے کہ جب وہ حبشہ میں مقیم تھے تو کسی دوسری طاقت نے حبشہ پر حملہ کرنا چاہا، تو انھوں نے بھی حبشہ کی اس وقت کی حکومت کی طرف سے مدافعت کی یا مدافعت میں شرکت کا فیصلہ کیا اور اس بنا پر کیا کہ جو مراعات ہمیں نجاشی سے حاصل ہیں وہ دوسرا نہ دے گا۔

مجھے اس روایت کی ضرورت ہے۔

۲:- نیز اہون البلیتین کے نظریہ کے تحت اس قسم کے اقدامات کی جو اور سندیں ذہن میں

ہوں ان کی بھی مجھے ضرورت ہے۔

۳:- غیر اسلامی حکومتوں کی ملازمتوں کے بارے میں فقہ میں تصریحات بھی تو ہیں مجھے ان کی بھی ضرورت ہے۔

۴:- غرض اس موضوع سے متعلق جو مواد فراہم ہوسکتا ہو مجھے اس کی ضرورت ہے اور زیادہ تاخیر کی بھی وقت میں گنجائش نہیں ہے۔ جہاں تک ہوسکے عبارتیں ہی نقل کرادی جائیں بدرجہ مجبوری حوالے ہی تحریر فرمادیے جائیں میں دارالعلوم کے کتب خانے سے تلاش کرالوں گا۔

والسلام

دعا کا محتاج محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

شاید معلوم ہوا ہو کہ دیوبند و مظفر نگر میں عید اتوار کو ہوئی۔

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ- ۲۲ر شعبان ۸۱ھ

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم سلام مسنون۔

۱۴ر شعبان کو میں بھوپال چلا گیا تھا، واپسی پر گرامی نامہ کے مطالعہ سے مشرف ہوا۔ او جز مولوی سعید الرحمٰن صاحب کے حوالہ کردی ہے، قیمت کبھی خود ہی لے لوں گا، ڈاک سے روانہ فرمانے کی بالکل ضرورت نہیں۔

ترمذی کے تحشیہ کا مسئلہ نہایت اہم ہے، اور تحفہ کے بعد کام فی الجملہ آسان بھی ہوگیا ہے۔ میرے پیش نظر حنفی نقطۂ نگاہ سے زیادہ عام اہل درس اور طلبہ کے لیے کتاب کی خدمت ہے۔

تحفہ پر صرف تعلیقات کے تو میں بالکل حق میں نہیں ہوں، میرا خیال ہے کہ مولانا عبدالجبار صاحب اور ایک اور کسی ذی استعداد نوجوان کو کچھ ساتھ لگا کر کام آسانی سے ہوجائے گا، بنام خدا شروع فرمادیا جائے۔ طباعت کا انتظام انشاء اللہ زیادہ مشکل نہ ہوگا، اور اگر مفتاح العلوم یا کوئی ادارہ یہ کام اپنے طور پر کرائے تو یہ اس کے لیے بہت بڑی جائداد بھی ہوگی۔

حضرت رائے پوری دامت برکاتہم [کا] قیام آج کل رائے پور ہی میں ہے، لیکن اس کا

امکان نظر آرہا ہے کہ بعد رمضان لاہور تشریف لے جائیں، اگرچہ مہینوں سے ضعف کا یہ عالم ہے کہ بات بھی صحیح طور سے نہیں کی جاسکتی۔

حضرت شیخ الحدیث مدظلہ الحمدللہ بعافیت ہیں، یعنی مستقل عوارض کے علاوہ کوئی خاص بات نہیں ہے، عرصہ سے یہ معمول ہے کہ ایک ہفتہ سہارنپور قیام رہتا ہے اور ایک ہفتہ رائے پور۔

میرا ارادہ رمضان مبارک کے پہلے دوعشرہ میں لکھنؤ ہی رہنے کا آخری عشرہ میں انشاء اللہ رائے پور قیام رہے گا۔ مولوی عتیق الرحمٰن سلام عرض کرتے ہیں، مولانا عبدالجبار صاحب اور برادر مکرم مولوی رشید احمد صاحب کو سلام مسنون۔

والسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ دعا کا محتاج وطالب

محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

....

حضرت مخدومی محترمی! دامت فیوضکم

سلام مسنون

والا نامہ نے مشرف فرمایا، افاقہ کی اطلاع سے فی الجملہ اطمینان ہوا، اللہ تعالی کامل صحت وقوت عطا فرمائے۔ ممکن ہے اسی ہفتہ مئو حاضری ہو سکے، ۷ر جولائی کو جونپور میں دینی تعلیمی کانفرنس ہے، پہلے ارادہ نہیں تھا معذرت کردی تھی، لیکن آج ہی یہ خیال ہوا کہ وہاں سے مئو حاضر خدمت ہونا آسان ہوگا، اس لیے اب ارادہ کر رہا ہوں، اگر کوئی مانع پیش نہ آیا تو انشاء اللہ ۲ر کو کسی وقت حاضر خدمت ہو جاؤں گا۔

اب تو مجلس شوریٰ کی تاریخیں آگے بڑھ گئی ہیں اور میں نے اپنی ایک مجبوری سے اور کچھ آگے بڑھا دینے کے لیے لکھا ہے۔ بہرصورت اس وقت تک کچھ موسم بہتر ہو جائے گا، اس لیے میری تو اصرار سے رائے ہے کہ اس اجلاس کے موقع پر ضرور تشریف لے چلیں، والسلام۔

مولانا علی میاں اتوار کو لکھنؤ پہنچ گئے تھے، ایک ہفتہ کے لیے کل صبح رائے بریلی چلے گئے ہیں، جون پور شاید وہ بھی تشریف لے جائیں۔ والسلام آخرا

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ ۲۴/اکتوبر ۶۳ء

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم سلام مسنون۔

کافی دن ہوئے گرامی نامہ موصول ہوا تھا۔ غالباً اسی دن میں نے ''الاعلام'' کے بارے میں حفیظ سے دریافت کیا تو اس نے کہا کہ میں کاغذ نہیں خرید سکا اس لیے کتاب چھپ نہیں سکی ہے۔

میں نے ارادہ کرلیا کہ میں کاغذ خرید وا کے بھجوادوں اور کتاب چھپ جانے کے بعد گرامی نامہ کا جواب لکھوں۔

کاغذ ایک دوکان پہ مل بھی گیا، میں نے منگوا بھی لیا، لیکن بعد میں دیکھا تو کاغذ بہت ہلکا تھا اس لیے واپس کردیا۔ دوکاندار نے لکھا کہ جلدی ہی اچھا کاغذ میرے ہاں آجائے گا، آنے پر میں اطلاع دے دوں گا۔

اس کے بعد اتفاق سے میں نزلہ بخار میں مبتلا ہوگیا اور ڈاک کا کام بھی بالکل معطل رہا، اس لیے عریضہ بھی نہیں لکھ سکا۔

آج چوتھا دن ہے کہ اس قابل ہوا کہ دوکان پہ جاکے کاغذ خود دیکھ سکوں۔ چنانچہ کاغذ لے لیا۔ (یہ بھی عرض کردوں کہ اس سائز کا کاغذ کتب خانہ الفرقان کی ایک کتاب کے لیے بھی لینا تھا) بہر حال کاغذ میں نے پورا لے لیا، لیکن پریس میں وقتی کاموں کا کچھ ایسا تسلسل ہے کہ الاعلام نومبر کے پہلے ہفتے کے بعد چھپ سکے گی۔

میری کتاب معارف الحدیث جلد اول اتفاق سے انہی دنوں میں ختم ہوئی اور چونکہ لکھنؤ میں ہونے والے اجتماع کے پیش نظر اس کا فوراً چھپنا ضروری تھا، اس لیے پرسوں میں نے اس کی پلیٹیں نامی پریس بھجوائی ہیں۔

بہر حال الاعلام کے متعلق حفیظ نے کہا ہے کہ وہ نومبر کے دوسرے ہفتہ میں انشاء اللہ چھپ جائے گی۔ دوسرا گرامی نامہ طبیعت کی خرابی کے دنوں میں موصول ہوا تھا، لیکن مجھے اس کی اطلاع پرسوں ہوئی۔

علی میاں لندن سے اسپین جا چکے ہیں، ۳۰/اکتوبر کو جینوا واپس جا کر انشاء اللہ نومبر کے پہلے ہفتہ میں آجائیں گے، اگر صحت آج کل خراب نہ ہو تو اجتماع کے موقع پر ۲-۳ دن کے لیے تشریف لے آیئے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۱۱ر مئی ۶۴ء

حضرت مخدومی معظمی! دامت فیوضکم - سلام مسنون

دونوں ٹرینوں میں جگہ آرام کی مل گئی اور میں بحمد اللہ بعافیت لکھنؤ آ گیا۔

عنقریب ہی جمشید پور وغیرہ جانے کا ارادہ ہے، میں نے اُس رقم کے بارہ میں - جو مغربی بنگال کے مظلومین کی اعانت کی اپیل پر ہمارے ہاں آئی تھی اور اُس میں سے ابھی کچھ صرف نہیں ہوئی ہے - دریافت کیا تھا کہ جمشید پور اور راوڑکیلا وغیرہ کے مظلومین اگر بہ نسبت مظلومین مغربی بنگال کے زیادہ حاجت مند معلوم ہوں تو کیا اس رقم کا کچھ حصہ ہم ان پر بھی صرف کر سکتے ہیں۔ ہمارا اندازہ قریب بہ یقین یہ ہے کہ جن لوگوں کی وہ رقمیں ہیں اگر ہم اُن کے سامنے یہ بات رکھیں تو وہ سو فیصد ہماری صوابدید پر محمول کر دیں گے، لیکن اُن سب سے مراجعت کرنا قریباً ناممکن ہے، ایسی صورت میں کیا ہم لوگ (ٹرسٹ ندائے ملت) ایسا کر سکتے ہیں کہ اس رقم کا کچھ حصہ جمشید پور وغیرہ کے حاجتمند مصیبت زدہ مسلمانوں پر صرف کر دیں؟

آپ کا فرما دینا ہم لوگوں کے اطمینان کے لیے کافی ہوگا۔

....

مولانا علی میاں امید ہے کہ شام کو دہرہ دوا ایکسپریس سے پہنچیں گے، انشاء اللہ کل ان سے اور مولوی تقی امینی صاحب سے بات کروں گا، میں نے راستہ میں آپ کے نوٹس کا کافی حصہ پڑھ لیا۔ قریباً $\frac{80}{100}$ ان حصوں سے متعلق ہے جن کے بارہ میں میں نے صراحةً مشورہ دیا تھا کہ ان کو نکال دیجئے، مگر ہر آدمی کو اپنے.......[1] سے بڑی محبت ہوتی ہے، والسلام۔

محمد منظور نعمانی

....

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

لکھنؤ - ۴ر جون ۶۴ء

حضرت مخدومی! دامت فیوضکم - سلام مسنون

گرامی نامہ نے مشرف فرمایا، اس سے مزاج سامی کی ناسازی کا علم ہوا، خدا کرے اب

(۱) یہاں ایک لفظ پڑھا نہیں جا سکا ہے، اس کی جگہ نقطے دے دیئے گئے ہیں مدیر (مسعود احمد)

صحت ہو چکی ہو، میں ۷ارمئی سے ۲۶رمئی تک جمشید پور، راؤڑ کیلا اوران کے اطراف میں رہا ہوں، وہاں سے واپس آ کرفوراًہی سنبھل اور وہاں سے دہلی چلا گیا، یکم جون کو واپسی ہوئی، بظاہر گرمی کی شدت سے بخار سنبھل ہی میں ہو گیا تھا جس کا سلسلہ کچھ اب تک چلتا رہا، آج ٹمپریچر بالکل نہیں ہے الحمد للہ۔

میرے خیال میں جناب والا کی صحت کا مسئلہ بہت ہی قابل فکر وتوجہ ہے، آئے دن کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ ایسی صحت وتوانائی عطا فرمائے جس سے وہ کام انجام پاسکیں جن کی کسی اور سے توقع نہیں۔

....

''علماء دیوبند کا مسلک'' میرے ایام سفر میں آیا تھا، میں اس سے بے خبر تھا، پہلے جناب کے گرامی نامہ میں اس کا ذکر پڑھا، آج اتفاق سے گھر میں ایک طویل القامت پیکٹ پر نظر پڑی، غلاف چاک کیا تو معلوم ہوا کہ وہی ہے، میں نے نظر ڈالی ہے، میرے خیال میں صفائی سے اظہار رائے ضروری ہے، شروع کے ۵-۶ صفحے جو تمہید کے ہیں جن میں ''ما انا علیہ واصحابی'' پر کلام کیا گیا ہے، بہت ہی الجھے ہوئے اور دور از کار ہیں۔ آگے بیان مسلک میں بھی جابجا گول گول باتیں کی گئی ہیں جو اصل مدعا ہے، اگر سادہ صاف انداز میں لکھا جائے جو موضوع کا تقاضا ہے تو بس زیادہ سے زیادہ ایک جز میں سب کچھ اور مؤثر اور دل نشیں پیرایہ میں کہا جا سکتا ہے۔ میری گزارش یہ ہے کہ املاءً کچھ لکھا کے میرے پاس روانہ فرما دیا جائے، اس کی تائید میں میں بھی کچھ لکھ دوں گا، تنقید اور اظہار خلاف کے بجائے ترمیم واصلاحی مشورہ کا انداز بہتر ہوگا۔

بہرحال یہ ضروری ہے کہ یہ بصورت موجودہ اس حیثیت سے شائع نہ ہو۔ میں نے ایک مختصر خط تو آج ہی لکھ دیا ہے اور آئندہ مزید تفصیل سے کچھ عرض کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے اس امید پر کہ آپ کچھ تحریر فرما دیں گے اور میں بھی لکھوں گا، اعلام مرفوعہ کے سلسلہ کی رقم وصول ہو گئی ہے۔

والسلام محمد منظور نعمانی عفا اللہ

بھائی مولوی رشید احمد صاحب! سلام مسنون اس منی آرڈر کی رسید میں نے ندائے ملت کے مینیجر صاحب کو دے دی تھی اور زبانی ان سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ رسید میں دیکھ چکا ہوں۔ والسلام

(فتویٰ)

بُننے اور بُنوانے کی جائز صورتیں

از: حضرت محدث کبیر رحمۃ اللہ علیہ

[حضرت محدث الاعظمی رحمۃ اللہ علیہ کا تحریر فرمودہ یہ فتویٰ آپ کے کاغذات میں اتفاقاً دستیاب ہوگیا ہے، بہت پہلے کا تحریر کیا ہوا ہے، جس کاغذ پر مرقوم ہے اس کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ۷۰-۷۵ سال پہلے کا لکھا ہوا ہے (ادارہ)]

مئو اور اطراف میں جو لوگ تھوڑا بہت سرمایہ رکھتے ہیں وہ بجائے خود کپڑا بننے کے دوسرے اشخاص سے جن کے پاس سرمایہ نہیں ہے کپڑے بُنواتے ہیں، آج سے دو ایک سال پہلے دوسروں سے کپڑے بُنوانے کی عام طور پر جو صورت تھی، اس کو یہاں کی اصطلاح میں **بانی** کہتے ہیں۔

بانی کی صورت یہ ہے کہ مثلاً زید کچھ سوت یا ریشم عمرو کو دے اور کہے اس سوت یا ریشم کا فلاں کپڑا تیار کر کے تم کو فی گز مثلاً ایک آنہ یا دو آنہ مزدوری دی جائے گی۔ یا اس سوت یا ریشم سے فلاں چیز کے تھان بُن لاؤ، ہر تھان مثلاً ۸/گز، یا ۱۳/گز کا ہوگا اور فی تھان آٹھ آنے یا بارہ آنے مزدوری دی جائے گی۔ یہ صورت شرعاً اجارہ میں داخل ہے اور جائز ہے بشرطیکہ مزدوری پہلے ہی متعین کر کے بتا دی جائے۔ اور اگر مزدوری متعین کر کے بتائی نہ جائے مثلاً کہہ دیا جائے کہ جو مناسب ہوگا دے دیا جائے، تو جائز نہیں ہے۔

پوت

پہلے عموماً بانی ہی کا رواج تھا، لیکن دو ایک سال سے ایک اور صورت پیدا کی گئی اور اب بکثرت وہی رائج ہے۔ وہ یہ ہے کہ کوئی کاریگر کسی سرمایہ والے آدمی (یا گرہست) سے بننے کے لیے کچھ مانگتا ہے، تو وہ اس کو سوت یا ریشم اس دن کے بھاؤ سے آٹھ آنے یا بارہ آنے زیادہ پر دیدیتا ہے، کاریگر اسی زائد دام پر سوت یا ریشم لے لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی، خرچی کے نام سے دو چار روپے قرض بھی لیتا ہے، گرہست یہ قرض بھی دے دیتا ہے، اور کہتا ہے کہ اس سوت یا ریشم سے جو مال تیار کرنا اس کو میرے پاس لانا، میں اس کو فروخت کر کے اپنے سوت یا ریشم کی قیمت اور خرچی والی رقم کاٹ کر جو بچے گا وہ تم کو دیدوں گا، اس صورت کا نام یہاں کی زبان میں **پوت** ہے، یہ صورت شرعاً بیع میں داخل ہے اور ناجائز ہے۔

پوت کے ناجائز ہونے کی وجہ:

اور اس کی دو وجہیں ہیں: ایک یہ کہ اس میں عرفاً خریدار (کاریگر) کی طرف سے قرض (خرچی) کی شرط ہے، چنانچہ اگر گرہست خرچی نہ دے تو کاریگر ہرگز آٹھ یا بارہ آنے مہنگا سوت یا ریشم نہ لے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ عرفاً بائع (گرہست) کی طرف [سے] یہ شرط ہوتی ہے کہ کاریگر مال تیار کر کے گرہست کی معرفت بکوائے، چنانچہ اگر کاریگر بطور خود بیچ ڈالے تو گرہست سخت ناراض ہوتا ہے، بلکہ عموماً آئندہ اس کو سوت وغیرہ نہیں دیتا ہے۔ اور یہ دونوں شرطیں خلاف مقتضائے عقد ہیں، اور ایک میں مشتری کا دوسرے میں بائع کا نفع ہے۔ اور ایسی شرطیں جس بیع میں ہوں وہ ناجائز ہے، اس کو توڑ دینا واجب ہے (درمختار ج۴ص۱۳۱)۔

اس بیع کے ذریعہ جو نفع کمایا جائے وہ خبیث ہے بیع فاسد سے مل کر خبیث حرام حاصل ہوتی ہے (شامی ج۴ص۱۳۰) کھانے کی چیز ایسی بیع کے ذریعہ خریدی جائے تو اس کا کھانا حلال نہیں ہے، درمختار ج۴ص۱۳۱۔

عالمگیری ج۳ص۱۵۲ میں قاضی خاں کے حوالہ سے مذکور ہے کہ کسی نے کسی کے ہاتھ کوئی چیز اس شرط پر بیچی کہ خریدنے والا اس کو کچھ قرض دے تو بیع فاسد ہے۔ اور خلاصۃ الفتاویٰ کے حوالہ سے مذکور ہے کہ کسی نے اس شرط پر کوئی چیز خریدی کہ بیچنے والا اس کو کچھ (مثلاً ہزار روپیہ) قرض دے، تو یہ بیع فاسد ہے۔ اور ایسا ہی ج۳ص۱۵۲ میں ذخیرہ سے منقول ہے، اور ج۳ص۱۵۱ میں سراج وہاج کے حوالہ سے مذکور ہے کہ اگر زید نے ایک غلام (مثلاً) اس شرط پر بیچا کہ خریدار اس کو جب بیچے گا تو اس کے دام کا زید ہی حقدار ہوگا، تو یہ بیع بھی فاسد ہے۔

اگر کسی کو یہ شبہہ ہو کہ سوت دینے کے وقت شرط کا ذکر نہیں آتا، اس لیے عقد کے وقت شرط نہیں ہوئی، تو جواب یہ ہے کہ پہلے سے شرط ہو جائے اور سوت دینے کے وقت شرط کا ذکر نہ آئے جب بھی ناجائز ہے، جیسا کہ شامی ج۴ص۱۲۷ سے واضح ہے۔

اگر یہ شبہہ کیا جائے کہ بعض جگہ زبان سے ان شرائط کا ذکر نہیں ہوتا، تو گذارش ہے کہ مگر دستور کے مطابق عمل اسی طرح ہوتا ہے، اور اگر بائع یا مشتری کوئی ان شرائط کے مقتضا کے خلاف کرے مثلاً کاریگر مال تیار کر کے خود بیچ ڈالے، یا گرہست خرچی نہ دے، تو نہ کاریگر سوت لے گا نہ گرہست دے گا، لہٰذا بموجب اصول **المعروف عرفاً کالمشروط شرطاً** یہ دستور ہی خود بمنزلہ شرط ہے اور عدم جواز کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔